نمود شمارہ ۳، ۲۰۱۴ء

فہرست

اداریہ

مضامین

میراجی کی نظم ''رتجگا'': تجزیہ	ملک محمد دانش	(طالب علم لمز)	۷
نسرین انجم بھٹی کی نظم ''چوہے'': تجزیہ	سید عمار اختر کاظمی	(طالب علم لمز)	۱۶
افضال احمد سید کی نظم ''پھانسی'': تجزیہ	محمد نعمان امین	(طالب علم لمز)	۲۴
''اوورکوٹ'': غلام عباس اور گوگول کے افسانوں کا موازنہ	ولید خان	(طالب علم لمز)	۳۲

افسانہ/تخلیقی نثر

مورتیوں کا بازار	سدرہ خان	(طالب علم لمز)	۳۷
کرانا	علی امین	(طالب علم لمز)	۴۲
شہرِ خموشاں کے مکین	راؤ فواد قمر	(طالب علم لمز)	۴۷
اسٹیٹس سمبل	محمد حمزہ نسیم	(طالب علم لمز)	۵۱
بے بسی اور بے حسی	ذیشان دانش	(شریک تحقیق لمز)	۵۵
ہمسفر	محمد سلمان خالد	(طالب علم لمز)	۵۸
تلاش	حافظ فخر حیات	(طالب علم لمز)	۶۲

حوا کی بیٹی	روا رشید	(طالب علم لمز)	۶۵

انٹرویو

افتخار عارف	فرقان اشرف	(طالب علم لمز)	۶۹

اردو ادب سے انتخاب

آخری رات	عزیز حامد مدنی (۱۹۲۲ء۔۱۹۹۱ء)	۷۶
غزلیں	سلیم احمد (۱۹۲۷ء۔۱۹۸۴ء)	۷۸
ریڈیو والے نواب صاحب	اسد محمد خاں	۸۰

ترجمہ

انسان	قاضی نذر الاسلام ترجمہ: محمد یوسف صدیق	(فیکلٹی لمز)	۸۴

انگریزی مضامین

Zahid Dar's "Mera Pagalpan"	Bushra Shehzad	(Student / LUMS)	3
Man in the Metropolis: Exploring the Possibility of *flânerie* in Intizar Husain's *Basti*	Noor Habib	(Student / LUMS)	7

اداریہ

یہ سال نمود کی اشاعت کا تیسرا سال ہے۔ نمود کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ یہ لمز کا واحد اردو رسالہ ہے، جو طلبہ کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ پہلے دو شمارے جب شائع ہوئے تو انھیں نہ صرف لمز کے طلبہ نے بلکہ دوسرے اداروں کے طلبہ نے بھی سراہا اور لمز کے علاوہ دیگر اداروں کے اساتذہ اور ادبا نے بھی بہت حوصلہ افزائی کی۔

تازہ شمارے میں خاص بات یہ ہے کہ اردو ادب سے متعلق انگریزی میں لکھی ہوئی تحریروں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ایک حصہ اردو ادب سے انتخاب پر مشتمل ہے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ گرمانی مرکزِ زبان و ادب کے تحت پڑھائے جانے والے کورس تعداد میں اب پہلے سے زیادہ ہیں۔ انھی میں تقابلی ادب کے کورس بھی شامل ہیں۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اردو، فارسی اور عربی کے کورس صرف شعبۂ ادبیات اور سماجی علوم ہی کے طالب علم نہیں لیتے بلکہ یونی ورسٹی کے دوسرے شعبوں یعنی بزنس سکول، انجینئرنگ اور کمپیوٹر سائنس کے طالب عالم بھی اپنی دلچسپی کے مطابق گاہے گاہے یہ کورس لیتے رہتے ہیں۔ اسی لحاظ سے نمود میں شامل تحریریں بھی کلی طور پر یونی ورسٹی کے تمام طالب علموں کی نمائندگی کرتی ہیں۔

اس رسالے کی ترتیب وتدوین چند لوگوں کی مشاورت اور حوصلہ افزائی کے بغیر ممکن نہیں تھی۔ان میں گرمانی مرکزِ زبان وادب کی منتظم اعلیٰ یاسمین حمید صاحبہ کا نام سرِفہرست ہے۔خصوصی شکریہ ضیاء الحسن صاحب کا جو ہمیشہ ہماری معاونت کرتے ہیں۔میں ہاجرہ خالد کا بھی شکرگزار ہوں جنھوں نے رسالے کا متن کمپوز کیا اور ذیشان دانش صاحب کا جنھوں نے اس کی formatting کی۔اس رسالے کے معاون مدیر عمار اختر کاظمی اور عاکف رمضان جو بڑی محنت اور لگن سے اشاعت کے تمام مراحل میں شامل رہے، اور انصر محمود جنھوں نے سرورق تیار کیا، ان سب کا بھی تہہ دل سے احسان مند ہوں۔آخر میں ان سب طالب علم دوستوں اور اساتذہ کا شکریہ جنھوں نے رسالے کے لیے اپنی نگارشات فراہم کیں۔

ہم امید کرتے ہیں کہ ہماری اس کاوش کو آپ پسند کریں گے اور ہمیشہ کی طرح اپنی آراء اور تجاویز سے ہماری رہنمائی فرمائیں گے۔

فرقان اشرف

ملک محمد دانش

میرؔاجی کی نظم ''رتجگا'': تجزیہ

نظم ''رتجگا'' میرؔاجی کی کامیاب نظموں میں سے ہے۔اگر چہ ایک پیچیدہ نظم ہے مگر ابہام کے پردوں میں معانی پوشیدہ ہیں۔اس نظم میں شعور کی رو پر بہتا ہوا خیال نظر آتا ہے جس کی وجہ سے یہ نظم ایک نقش کی سی صورت اختیار کرتی ہے۔اس میں منطقی تسلسل تلاش کرنا عبث ہے۔

صنف کے اعتبار سے یہ نظم معریٰ ہے۔اس نظم میں بے حد غنائیت اور صوتی نغمگی موجود ہے۔اگر چہ نظم میں ایک سوز و درد کی کیفیت بھی موجود ہے مگر خوش آہنگی کی وجہ سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاعر اس درد میں ایک لذت اور راحت محسوس کر رہا ہے۔

اس سے پہلے کہ نظم کے معنی کو کرید کر نکالا جائے،اس کے عنوان کو ایک نظر دیکھ لینا ضروری ہے۔''رتجگا'' کا مطلب شب بیداری یعنی رات بھر جاگنا ہے۔رات بھر جاگنے والا کون ہے؟ شاعر بھی ہو سکتا ہے یا کوئی بھی۔رات بھر جاگنے والے شخص کی ذہنی کیفیات اور لاشعور میں ابھرنے والے وہ احساسات،جن کو مربوط اور منطقی تسلسل میں بیان کرنا ممکن نہیں،میرؔاجی نے ایک نقش کی صورت بیان کیا ہے۔

یہ شب بیداری ہجر و فراق سے پیدا ہونے والے ہیجان کا نتیجہ بھی ہو سکتی ہے اور وصال کی شب بھی ہو سکتی ہے۔مگر اس نظم کے حوالے سے دیکھا جائے تو رتجگا وصال کی وجہ سے نہیں ہے کیونکہ شاعر کے بیان میں ہمیں اکیلا پن، احساسِ تنہائی اور کسی کے ساتھ بیتے ہوئے وقت کی یادوں کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔

شب بیداری کا ایک عارفانہ پہلو بھی ہے۔عشقِ حقیقی سے لبریز شخص کے لیے رات کا وقت وہ موقع ہوتا ہے

جس میں وہ عبادت وریاضت سے معبودِ حقیقی کے قرب کا متلاشی ہوتا ہےاور عرفانِ حق کے لیے بے چین ہوتا ہے۔ نظم کے بعض مصرعوں میں ہمیں یہ پہلو بھی نظر آتا ہے۔جس کا ذکران کی تشریح کرتے وقت کیا جائے گا۔

جمیل جالبی نے میرؔاجی کو پڑھنے کا جو طریقہ بتلایا ہے، وہی دراصل سب سے بہتر ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ 'میرؔاجی کو پڑھتے وقت قاری کے ذہن کو اس قدر دھچکے لگتے ہیں کہ وہ اگر ذرا سی اکتاہٹ محسوس کرنے لگےتو میرؔاجی کی شاعری اس کے لیے بے معنی ہو جاتی ہے۔میرا جی کو پڑھنا واقعی صبر آزما کام ہے۔۔۔نظم پڑھتے وقت ایک ایک مصرعے پرنظر رکھنی ہوتی ہےلیکن ایک مصرعے کا دوسرے سے ربط تلاش کرنا غلطی ہے'۔

اس لیے نظم کو سمجھنے کے لیے پانچ حصوں میں تقسیم کرلیا گیا ہے۔

پہلے حصے کے، پہلے مصرعے میں کہتے ہیں 'کالے بال نہیں یہ تیرے'۔یہاں لفظ 'تیرے' سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ کوئی اور بھی شاعر کے پاس موجود ہے جس سے وہ مخاطب ہے۔ہوسکتا ہے کہ وہاں کوئی اور نہ ہو صرف شاعر کا تخیل ہو جیسا کہ اگلے مصرعوں میں ہمیں تنہائی کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ ہماری روایتی شاعری میں کالے بال تو حسن کی علامت سمجھے جاتے تھے مگر یہاں پر تنہائی کا استعارہ بن کر ابھرے ہیں۔اور تنہائی بھی تاریک ہے یعنی امید کی کوئی کرن باقی نہیں ہے۔یہ بھی ممکن ہے کہ میرؔاجی خود سے مخاطب ہوں اور اپنی گھنی زلفوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہوں کہ اب کوئی نہیں جوان کو سہلائے اور محبت بھرا ہاتھ پھیرے۔ کالے بالوں اور تاریک تنہائی کے علاوہ دیگر images جو اس حصے میں استعمال ہوئے ہیں ان میں روزن میں لپکتے سائے لہراتی ہوئی شاخیں، آتش دان میں لپکتے شعلے اور بلند پرواز کرتا ہوا سوچ کا پرندہ شامل ہیں۔

یہ سب چیزیں ایک تصویری پیکر سا بناتی ہیں کہ گویا سردی کے موسم میں آتش دان کے پاس کوئی تنہا موجود ہےاور رات کاٹ کر رہا ہے۔روزن میں کوئی سایہ سا دکھائی دے رہا ہے۔شاید وہ کسی کے انتظار میں ہے یا کسی کو یاد کر رہا ہے، اس لیے کسی کے آس پاس ہونے کا احساس شدت سے محسوس ہو رہا ہے۔مگر میرا جی نے اس احساس کو سادہ لفظوں میں بیان کرنے کی بجائے مختلف چیزوں کے ذریعے تخیلاتی پیکر تشکیل دیا ہے جس سے قاری یہ محسوس کرسکتا ہے کہ تنہائی میں اس کو کسی کی یاد ستا رہی ہے۔

عموماً جب انسان اکیلے کسی جگہ موجود ہوتا ہے تو اسے یوں لگتا ہے کہ شاید اسے کوئی اور کہیں سے جھانک کر دیکھ رہا ہو۔ روزن میں لپکتے سائے اسی چیز کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ یہاں شاخوں کے پیراہن کی ترکیب استعمال ہوئی ہے جس سے مراد درخت اور شاخیں ہی ہیں جنھوں نے سبز رنگ کا گویا لباس زیب تن کیا ہوا ہے۔ شاخیں ہوا کی وجہ سے لہراتی ہیں اور ہوا کسی کے آنے کا سندیسا بھی ہوتی ہے۔ یہ شاعر کا تخیل ہے۔

ایک درد اور اضطراب کی سی کیفیت ہے۔ دل میں درد کا اٹھنا غمِ محبت کا باعث بھی ہو سکتا ہے۔ دل قلبی کیفیات کا مظہر ہے۔ جذبات و احساسات کا منبع و مرکز ہے۔ جذبوں کی نمود اسی زمین سے ہوتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی شاعر لکھتا ہے کہ ٹھہرو! شاید یہ بھی ایک دھوکا تھا۔ کیا روزن میں لپکتے سائے دھوکا ہیں یا دل میں اٹھتی ہوئی ٹیس دھوکا ہے۔ یہاں پر ابہام موجود ہے۔

آتش دان کے پاس لپکتے شعلے شاید شاعر کے تڑپتے ہوئے دل کی غمازی کر رہے ہیں۔ اگر اسے اگلے مصرعے سے ملا کر پڑھیں تو شاید مفہوم واضح ہوتا جاتا ہے کہ یہ شعلے ظاہری طور پر تو آنکھوں کو اپنی چمک سے خیرہ کر رہے ہیں مگر اندر سے یہ کتنے مجبور ہیں کہ جلنا ہی ان کا مقدر ہے۔ اسے شاعر نے 'طرفہ غضب' ڈھانے والے لکھا ہے۔

یہ شاید اردگرد کے ماحول ہی کی اثر انگیزی ہے جس نے شاعر کی طبیعت پر ایسا اثر ڈالا ہے کہ اس کے دل میں جنم لینے والے جذبات و احساسات آہستہ آہستہ لفظوں کا روپ دھار کر صفحۂ قرطاس پر نمودار ہو رہے ہیں۔ تنہائی بھی ایک inspiration ہے، جس کی شدت کو شاعر محسوس کر رہا ہے اور یہ جذبہ الفاظ کا روپ دھار رہا ہے۔ ایک کرب و اذیت کا عنصر بھی موجود ہے جو شاعر کو، تخلیق کار کو، تخلیق پر اکسا رہا ہے۔

قلبی احساسات کے الفاظ میں ڈھلنے کو شاعر نے تخیل کے رسنے سے تشبیہ دی ہے۔ سب سے پہلے ذہن میں ایک خیال پیدا ہوتا ہے جو تخیل کا روپ دھار لیتا ہے۔ پھر وہ تخیل تصور بن جاتا ہے اور اس کے بعد وہ تصویر کا روپ دھار لیتا ہے۔ تخیل یا خیال سے تصویر تک کا مرحلہ سست رو بھی ہے اور تکلیف دہ بھی۔

تخیل کا شرما کر مٹ جانے سے مراد یہ ہو سکتا ہے کہ وہ تخیل جب لفظوں کا روپ دھار لیتا ہے تو وہ پھر تخیل نہیں رہتا اس کی جگہ کوئی اور خیال ذہن میں آ جاتا ہے۔ تخیل کا شرمانا شاید شرمندگی کے طور پر نہیں لیا گیا بلکہ اس کے

وجود کے اختتام پذیر ہونے سے مراد لیا گیا ہے۔

اس خیال کی پرواز میں معتدل مزاجی بہت ضروری ہے۔ جب ذہن میں تخیل کوئی شکل اختیار کر رہا ہو تو اس وقت جلد بازی نہیں کرنی چاہیے ورنہ وہ پاش پاش ہو جائے گا۔ اس کو بننے اور پروان چڑھنے کا مکمل موقع دیا جانا انتہائی ضروری ہے تا کہ وہ ایک مربوط شکل اختیار کر سکے۔

تخیل کو پرندے سے تشبیہ دی ہے۔ ایسا پرندہ جو ابھی کمزور ہو، جس نے ابھی ابھی اڑنا سیکھا ہو، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اونچی اڑان نہ بھرے، ورنہ وہ ہوا کی تیز موجوں اور تندیِ باد مخالف کی تاب نہ لا سکے گا۔ اس کے پَر جل جائیں گے۔

طائر کے پروں کا جلنا اس واقعے کی طرف اشارہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب روح القدس سدرۃ المنتہیٰ کے مقام پر پہنچ کر رک گئے تھے کہ ان کے پَر، اگر وہ آگے بڑھے تو، جل جائیں گے۔ یعنی اپنی استطاعت کے اعتبار سے قدم اٹھانا چاہیے۔

دوسرے حصے کی طرف بڑھنے سے پہلے جمیل جالبی کی اس بات کو سمجھنا ضروری ہے کہ ''حقیقت کو خواب بنانے کے عمل میں میرؔا جی پہلے خارجی چیز کا ذکر کرتے ہیں پھر اس تصور کو مٹا دیتے ہیں اور پھر دوسرے لمحے وہ اندر اتر جاتے ہیں جہاں خواب میں، تصورات میں، ماضی کی حسین دلکشی ہے''۔

قاری کو اس transition کا احساس تب ہوتا ہے جب وہ داخلی دنیا کے مظاہر میں خود کو کھڑا پاتا ہے۔ ماضی کی یادیں ایک خوبصورت گلدستے کی طرح گلدان میں سجی ہوئی ہیں۔ گلدان عموماً مٹی کا بنا ہوا ہوتا ہے اور انسان بھی مٹی سے بنا ہے، تو ممکن ہے کہ گلدان انسانی جسم کا استعارہ ہو جس کے اندر ماضی کی حسین یادیں پھولوں کی طرح سجی ہوئی ہوں۔ یا اس کا دوسرا پہلو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ نازک نازک پھول انسان کی مختلف اور اچھی خصلتوں اور عادات کو ظاہر کرتے ہوں مگر اِس طرح یہ بات قطعاً انفرادی یا داخلی دنیا تک ہی محدود نہیں رہے گی بلکہ اجتماعی صورت اختیار کر لے گی۔ اس لیے ہم اپنی پہلی والی بات کی طرف واپس پلٹتے ہیں۔

ماضی کی خوبصورت اور دلنشیں یادوں پر رفتہ رفتہ زمانے کی گرد جمتی رہتی ہے اور وقت گذرنے کے ساتھ

ساتھ وہ یادیں موہوم سی ہو جاتی ہیں۔ پھونک مارنے سے ان پتیوں کے نیچے چھپی ہوئی خوشبو دوبارہ ہمیں مہکا دیتی ہے۔ پھونک مارنے سے مراد یہی ہے کہ کوئی ایسا واقعہ ہو جائے جس کی بدولت وہ یادیں دوبارہ تازہ ہو جائیں اور ہمیں اس دور میں لا کھڑا کر دیں۔

بعد کے دو مصرعوں میں بھی اسی موضوع کو ایک اور انداز سے بیان کیا ہے۔ یہاں اگر چہ گلدان کی جگہ دیوار کا image استعمال کیا ہے کہ ان دیواروں پر ہمارے ملن کی یادیں نقش ہیں۔ اگر چہ یہ بے جان چیز ہے، مگر جو پل ہم نے ساتھ گذارے تھے یہ ان پر شاہد ہے۔

اگر چہ دیوار پر، سوائے اس سال کے، رنگ کیا جاتا رہا ہے مگر پھر بھی اس اکھڑے اکھڑے رنگ کے نیچے یادوں کی تہیں جمی ہوئی ہیں۔ دیواروں پر سفیدی سے مراد وہی بات ہے کہ وقت گذرنے کے ساتھ نئے واقعات و حادثات نے ماضی کی یادوں کو دھندلکوں میں دھکیل دیا ہے مگر وہ اس دیوار کا حصہ ہیں اور ذرا سا کھرچنے سے عیاں ہو جاتی ہیں۔

اسی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے نظم کے تیسرے حصے میں وہی پیراہن، گیسو اور روزن کے استعاروں کی مدد سے تنہائی کو ایک تشخص دیا ہے۔ جس طرح پچھلے حصے میں گلدان اور دیوار سے ماضی کی یادیں جھلکتی تھیں اب اس حصے میں ان یادوں کو گلابی پیراہن سے وابستہ کیا گیا ہے۔ گلابی پیراہن سے تو خیال عورت کی طرف جاتا ہے کیونکہ ایسا لباس عموماً وہی زیب تن کرتی ہیں۔ گویا یہ ایک نشانیِ محبوب ہے۔ اس گلابی رنگ کے لباس سے ماضی کی بہت سی یادیں وابستہ ہیں، گویا وہ یادیں اس کے بیچ ہی لپٹ کر سوئی ہوئی ہیں۔

تنہائی کی کیفیت، اس نظم میں، بھرپور طور پر چھائی ہوئی ہے۔ پیراہن میں بھی تنہائی چھپی ہوئی ہے۔ اس سے مراد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک مدت سے اس لباس کو زیب تن نہیں کیا گیا مگر ابھی بھی اِس میں سے اُس کی مہک آتی ہے۔ اُس کی زلفوں کی خوشبو ابھی بھی اِس پیراہن میں موجود ہے۔ 'پیراہن کی تنہائی میں گیسو رقصاں ہیں' ایک بڑا powerful image بناتے ہیں۔ یہ ایک تخیلاتی پیکر ہے جسے شاعر نے نقش کی صورت بیان کیا ہے۔ اگر چہ اِس مصرعے کا مفہوم و معنی کسی حد تک تو بیان کرنے کی سعی میں نے کی ہے مگر اس کو مزید کھولنے سے میرے نزدیک، اس کا

سارا حسن ماند پڑ جائے گا۔اس کو یہیں چھوڑ دینا بہتر ہے۔

اگلے مصرعے میں شاعر وہی بات دہرا رہا ہے جو اس نے پہلے حصے میں کی تھی کہ اسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ روزنِ دیوار سے کوئی اسے چھپ چھپ کر دیکھ رہا ہے۔تنہائی میں گویا قرب کا احساس بھی شاعر کو محسوس ہو رہا ہے۔گویا کوئی شاعر کی رات بھر تڑپتی ہوئی کیفیت کو دیکھ رہا ہے۔شاید یہ وہی ہو جس کے لیے شاعر بے چین ہے۔یہاں پر بھی عارفانہ پہلو نمایاں ہے کہ خالق تو اپنے بندے کو دیکھ رہا ہے اگر چہ اسے بندہ نہیں دیکھ سکتا۔اسی کو تو 'احسان' بھی کہا جاتا ہے۔

نظم کے چوتھے حصے میں شاعر کا وہم یقین کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔اب تک تو اسے صرف ایسا لگتا تھا کہ کوئی وہاں موجود ہے جو اسے دیکھ رہا ہے مگر اب تو شاعر نے بھی اسے بامِ روزن پر دیکھ لیا ہے۔اچانک کہتا ہے 'لو دیکھو لو دیکھو' گویا قاری کو بتا رہا ہے کہ اگر چہ تم اسے صرف میرا تخیل سمجھتے تھے مگر اب دیکھو۔شاید یہ بھی ممکن ہے کہ شاعر کا گمان اتنا پختہ ہو گیا ہے کہ سراب نے بھی اس کے لیے حقیقت کا درجہ پا لیا ہے۔مگر اس مصرعے میں بہت ابہام بھی ہے کیونکہ شاعر کہتا ہے'۔۔۔۔میں تھا، میرا ہاتھ، نہیں تم بولو'۔کہیں وہ روزنِ دیوار سے خود کو ہی تو نہیں جھانک کر دیکھ رہا ہے۔جب کوئی روشن دان سے چپکے سے جھانک رہا ہو اور اچانک کمرے میں موجود شخص کی نظر اس کی موجودگی کو بھانپ لے، تو وہ فوراً وہاں سے نیچے چھلانگ لگا کر بھاگنے کی کرتا ہے اور اس دوران اس کا لہراتا ہوا ہاتھ نظر آ جاتا ہے۔یہی بات میرا جی نے بھی کی ہے۔میرے خیال میں جب شاعر نے کہا 'لو دیکھو' تو وہاں موجود جو کوئی بھی تھا، چونک پڑا اور اس دوران اس کا ہاتھ بلند ہوا۔مگر ساتھ ہی میرا جی لکھتے ہیں کہ وہ بلند ہونے والا ہاتھ، روزنِ دیوار سے، میرا ہی تھا۔

اس بات کا مطلب یوں بھی لیا جا سکتا ہے کہ ایک بیرونی طور پر نظر آنے والا انسان ہوتا ہے اور ایک اندر کا انسان۔رات کے وقت، شاعر جسم کی سرحد سے یا روزنِ جسم سے جھانک کر اندر کے انسان کو دیکھنے کی کوشش کر رہا ہے اور اس جستجو میں سرگرداں ہے۔'تم بولو تو پھر کیا ہو گا' میں 'تم' اندر کا انسان بھی ہو سکتا ہے۔اگر اندر کا انسان بول پڑے، اس کا ضمیر جاگ اٹھے، تو انسانی زندگی میں کیسی کیسی تبدیلیاں رونما ہو جائیں گی۔واقعی وہ شخص، جس کی امید ہے

اور جس کے بارے میں یوں محسوس ہوتا ہے وہ چھپ چھپ کر دیکھ رہا ہے، اگر یکدم سامنے آ کر مخاطب ہو جائے تو کیا ہوگا۔

'یہ گلدان کی مینا کاری' یعنی ماضی کی حسین یادوں کا گلدستہ رنگا رنگ پھولوں سے نہ صرف مزین ہے بلکہ اس نے انسان کو بیرونی طور پر بھی خوبصورت بنا دیا ہے۔ اور یہ یادیں صرف دنوں یا سالوں کو نہیں بلکہ صدیوں کو محیط ہیں۔ ان مصرعوں کا آپس میں باہمی ربط نکالنا مشکل ہے۔ ہر ایک اپنے اندر ایک الگ اور منفرد معنی پوشیدہ کیے ہوئے ہے اور مجموعی طور پر ایک کیفیت کو بطور نقش بیان کرتے ہیں۔

رات کا پہر ہے جس میں کوئی شخص بیٹھا ہے، ایک اضطراب کی حالت عیاں ہے۔ چراغ ٹمٹما رہا ہے اور بجھنے کو ہے۔ عنقریب پھر تاریکی چھانے والی ہے۔ کالی زلفوں نے پھر ایک بار بکھر جانا ہے۔ اس نظم میں تاریکی اور اندھیرے کا استعارہ بارہا استعمال ہوا ہے۔ یہ شاعر کی ذہنی کیفیات کی غمازی کرتا ہے۔ اندھیرا مایوسی کا استعارہ ہے۔

اگلے مصرعے میں شاعر کہتا ہے کہ 'شرمانے کی بات نہیں ہے پھر بھی دھڑکن شرمائے گی'۔ اس مصرعے کو اگر اس حصے کے دوسرے مصرعے کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو غالباً اس سے مراد یہ ہے کہ جب اندر کا انسان بول پڑے گا اور سب کچھ سچ سچ بیان کر دے گا تو جھوٹ کے پردے، جو باہر کے انسان نے تان رکھے ہیں، چاک ہو جائیں گے۔ اس میں تھوڑی بہت شرمندگی محسوس ہونے کا عنصر پایا جاتا ہے۔ ایک عجیب سی کیفیت دل میں ضرور پیدا ہوتی ہے کہ اب وہ وقت آ گیا ہے جب کھرا اور کھوٹا الگ ہو کر رہ جائیں گے۔

آخری حصے میں کہتے ہیں کہ اتنی تاریکی ہو جائے گی، اتنی مایوسی پھیل جائے گی کہ تنہائی کا احساس ہی یکسر ختم ہو جائے گا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اب رات ختم ہونے والی ہے اور سویرا ہونے والا ہے مگر اس صبح کا ہرگز مطلب یہ نہیں کہ ایک نئے دور کا آغاز ہونے والا ہے بلکہ یہاں صرف 'رتجگے' کا اختتام ہے۔ جب رات ہی باقی نہ رہی تو اس میں جاگنا ہرگز 'رتجگا' نہ ہوگا۔ اس درد سے گذرے بنا اور کوئی چارہ بھی نہیں۔ 'سانسوں کی مجبور مہک' سے مراد یہی زندہ رہنے کی پابندی ہے اور اذیتِ دل کو سہتے رہنا مراد ہے۔ اندر کے جذبات کو قابو میں کب تک رکھا جائے۔ آخر کار یہ طوفان بھی آنسو بن کر باہر امڈ آتا ہے۔ گرم نمی وہ احساسات و جذبات کی حدت ہے جن کو ہم اندر دبائے رکھتے ہیں اور

پھر ایک روز وہ باہر نکل آتے ہیں۔

اس کے اظہار سے درد کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے اور اس کی شدت میں کمی آ جاتی ہے۔ درد گویا خاموش ہو گیا ہے۔ میرا جی نے ایک پوری رات کی منظر کشی کی ہے اور اس کے مختلف پہروں میں قاری کو اپنے ساتھ لے کر چلا ہے کہ اس رتجگے میں اس کا کن کن مراحل سے گذر ہوا۔ پہلے تنہائی کا احساس ہوا۔ پھر کسی کی یاد آئی۔ پھر شاعر ماضی کے جھروکوں میں چلا گیا اور درد کی تڑپ کی لہر دوڑ گئی۔ پھر یوں محسوس ہوا کہ کوئی اس کے پاس موجود ہے۔ اور اب گویا اس شب کا اختتام ہونے کو ہے۔ درد کی ٹیس اب خاموش ہو چکی ہے۔ اب یادوں کی وجہ سے چھائی ہوئی بے چینی ختم ہونے کو ہے۔ اب صبح ہونے کو ہے۔ اب رتجگا ختم ہونے کو ہے۔

(ملک محمد دانش لمز کے طالب علم ہیں)

کتابیات

۱۔ جالبی، جمیل۔ ''میرا جی کو سمجھنے کے لیے''۔ میرا جی ایک مطالعہ۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء۔

۲۔ _____۔ مرتب کلیات میرا جی۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء۔

رَتجگا

کالے بال نہیں یہ تیرے ، تنہائی کی تاریکی ہے
روزن میں سائے۔۔۔۔شاخوں کے پیراہن سے لہراتے ہیں
ٹیس اُٹھی ہے دل میں، لیکن ٹھہرو یہ بھی اک دھوکا تھا
آتش دان کے پاس لپکتے شُعلے طُرفہ غضب ڈھاتے ہیں
آنکھوں کی مخمور چمک سے سانسوں کی مجبور مہک سے

دِل کے ارادے دھیرے دھیرے کچھ لفظوں میں ڈھل جاتے ہیں
جیسے تخیل رِستے رِستے شرماتے ہی مٹا جائے
تیز اگر پرواز بہت ہو پَرطائر کے جل جاتے ہیں
یہ گُل دان بہت اچھا ہے پھول بھی دیکھو، نازک نازک
پھُونک تو مارو ، اِس پتی کے نیچے خوشبو چھپی ہوئی ہے
وہ دیوار ، سفیدی شاید اب کے سال نہیں کی ، لیکن
اُکھڑے اُکھڑے رنگ کے نیچے اور بھی تہ اِک جمی ہوئی ہے
میرے پاس بھی اک ایسا ہی نرم ، گلابی پیراہن ہے
جس میں یادیں لپٹے لپٹے خاموشی سے سوئی ہوئی ہیں
دیکھو تو پیراہن کی تنہائی میں گیسو رقصاں ہیں
وہ دیکھو روزن سے کِس کی آنکھیں چُھپ کر جھانک رہی ہیں
لو دیکھو لو دیکھو، میں تھا ، میرا ہاتھ، نہیں تم بولو
تم بولو تو پھر کیا ہو گا میرے دِل میں سوچ یہی ہے
یہ گلدان کی میناکاری صدیوں کی آواز بنی ہے
شمع اگر گُل ہو جائے گی کالے بال بکھر جائیں گے
شرمانے کی بات نہیں ہے پھر بھی دھڑکن شرمائے گی
تاریکی میں کھوئے کھوئے تنہائی کب یاد آئے گی
سانسوں کی مجبور مہک سے گرم نمی بھی رِستے رِستے
بہتا آنسو بن جائے گی، درد کی ٹیس ، بس اب خاموشی
خاموشی میں جھکتے جھکتے رات سویرا بن جاتی ہے
یادوں کی بے کل مدہوشی گرم اندھیرا بن جاتی ہے

نمود، شمارہ ۳، ۲۰۱۴ء

سید عمار اختر کاظمی

نسرین انجم بھٹی کی نظم ''چوہے'': تجزیہ

اُردو نظم میں جہاں پابند نظموں کو لکھا گیا وہیں آزاد اور نثری نظموں کو بھی تحریر کیا گیا۔ نثری نظموں کو لکھنے والے شعرا کی ایک لمبی فہرست ہے اور خصوصاً دورِ حاضر کے شعرا نے آزاد نظم کے ساتھ ساتھ نثری نظم کو بھی اپنے افکار کی ترجمانی کا ذریعہ بنایا ہے۔ نثری نظم معنوی اعتبار سے اپنے اندر ایک وسعت رکھتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نثری نظم میں احساسات اور جذبات کی ترجمانی کے لیے قافیہ بندی اور روایتی عروضی نظام کی اُس طرح سے پابندی نہیں ہوتی جیسا کہ عموماً آزاد اور پابند نظموں میں ہوتی ہے۔ شاید اسی وجہ سے نثری نظموں میں سادہ اور عام فہم موضوعات سے لے کر دقیق اور فلسفیانہ موضوعات شامل ہیں۔

نسرین انجم بھٹی کا شمار دورِ رواں کے اہم شعرا میں ہوتا ہے۔ انھوں نے بھی اپنے افکار کی ترجمانی کے لیے نثری نظم کا انتخاب کیا۔ موضوعات کے اعتبار سے اُن کے ہاں کافی انواع و اقسام کے موضوعات ہیں مگر عورت اور اس کے متعلق موضوعات پر انہوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ یہ امر قابلِ غور ہے کہ ان کے نزدیک، عورت صنف سے زیادہ ایک طبقہ ہے۔ وہ عورت کو بحیثیت طبقہ دیکھتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عورت کی صنف کے ہونے یا نہ ہونے میں عورت کا کوئی شعوری دخل نہیں اور نہ ہی یہ وہ امر ہے کہ جو خود مرد یا عورت کے دائرۂ اختیار میں ہو۔ مگر طبقاتی کشمکش میں خود عورت اور مرد کا اور اس کے نظام کا واضح عمل دخل موجود ہے۔ اس نظام کی فرسودہ و بے معنی روایات، تمدّن کی ظالمانہ رسوم اور تہذیب میں پائے جانے والے فرق، ان تمام عناصر کی موجودگی کے باعث عورت صنف سے نکل کر طبقہ بن جاتی ہے اور ایسا طبقہ کہ جس کے احساسات و جذبات اور حقوق اسکی ذات کی طرح بے معنی اور حقیر ہو جاتے

ہیں۔اس طرح کے بیان کے لیے نسرین انجم نے نظم سے وابستہ تخلیقی امکانات سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔نسرین انجم مشکل باتیں نہیں کرتیں مگر معاشرتی ناانصافیوں اور بُرائیوں کو بغیر کسی تمہیدی اختراع کے، کھُل کر بیان کرتی ہیں۔

موضوعِ سُخن ان کے مجموعے بن باس سے مُنتخب کردہ نظم ''چوہے'' ہے۔اس نظم پر بات کرنے سے پہلے اس کی تمہید میں یہ کہنا ضروری ہے کہ ہر نظم مختلف خیال رکھتی ہے جس کی وجہ سے اس کی پڑھت بھی مختلف ہو جاتی ہے۔اس طرح کی نظموں کو پڑھنے اور سمجھنے کے ساتھ ساتھ محسوس کرنا بھی ضروری ہے۔مطلب یہ کہ اگر ہم ہر ایک سطر دوسری سطر تک کوئی منطقی تسلسل نکالنا چاہیں گے تو وہ ناممکن سا ہوگا۔شاعری میں ابہام کا عنصر بھی اس کی تاثیر میں اضافہ کرتا ہے۔''چوہے'' کو لکھنے کے پیچھے بہرحال ایک منطق کارفرما ہے مگر معنوی سطح سے زیادہ کیفیاتی سطح پر اس میں ایک طرح کا ربط پایا جاتا ہے۔

''چوہے'' کو علامتی عنوان کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔اس نظم کا ایک موضوع غربت اور افلاس ہے مگر صرف غربت و افلاس تک محدود کر دینا بھی غلط ہوگا۔دراصل اس کا موضوع محرومی اور احساسِ محرومی ہے، اب چاہے محرومی اشیا کی سطح پر ہو یا ماورائی سطح پر۔اور اس محرومی پر کسی طرح کی بغاوت یا مزاحمت نہیں ہے بلکہ ایک sense of resignation پائی جاتی ہے، یعنی زندگی کے تلخ حقائق سے سمجھوتا کرلیا گیا ہے۔شروع سے آخر تک یہ نظم کسی ایسے شخص کی آپ بیتی معلوم ہوتی ہے جس نے زندگی کے تلخ ترین حقائق کو اور ان حقائق کی سفاکی کو محسوس کیا اور بلا اضافت تحریر کر دیا۔مثلاً یہ کہ چوہوں سے انسان کا اپنا تقابل، کہ یہ دونوں حیوان ہیں مگر شاید اس محرومی نے انسان کو چوہوں سے بھی بدتر بنا دیا ہے۔چوہوں کی انسان کی زندگی میں اہمیت ہے۔وہ دوست ہیں، رازدار ہیں، اور فاقے کے دونوں پردہ دار بھی ہیں۔یہ دوستی انسان کے لیے مفید ہے کہ فاقوں میں انھیں ان کے بچے کھچے ٹکڑوں کی ضرورت رہا کرتی ہے۔ہاں مگر انسان میں اور چوہوں میں ''رفتار کا فرق'' ہے۔اور شاید یہی رفتار کا فرق انھیں superior being بناتا ہے۔

نظم میں خیال کی رو ایک منطقی تسلسل میں نہیں چلتی، بلکہ ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ہے۔مگر یہ ٹکڑے یکجا ہو کر ایک معنی دیتے ہیں۔بیان کے حوالے سے اس نظم کے دو حصّے ہیں اور یہ ترتیب بار بار نظم میں آتی ہے۔ایک حصہ وہ ہے جہاں محرومی اور احساسِ محرومی کے حالات بیان ہیں۔اور دوسرا حصہ وہ جہاں ان حالات سے پیدا ہونے والے

اثرات کا بیان ہے۔اور یہی ترتیب چلتی ہے،اوراس ترتیب کے باعث معنوی سطح پر ایک مجموعی تاثر قائم ہوجاتا ہے۔ معنی کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اس میں تہیں موجود ہیں۔مثلاً چوہا خود ایک سطح ہے اور واقعتاً اس کے کچھ اور مطلب بھی ہیں۔جیسا کہ محرومی کے دَور کا ساتھی یا تقابل کرنے کے لیے میزان اور اس میں sub-topics بھی ہیں۔ کیا چوہے اور سور کا تقابل مظلوم اور ظالم کا تقابل ہے، یا بڑے اور چھوٹے جانور کا یا ان کی خصلتوں کا یا انسان اور جانور کا۔ہر قاری اس کو اپنے انداز میں پرکھے گا اور اس کے نزدیک اس کے مطالب مختلف ہوں گے۔یہاں یہ بات واضح رہے کہ فضا میں کوئی افسردگی یا لاچاری نہیں ملتی نہ ہی غم وغصہ پایا جاتا ہے۔عورت کا وجود اور مخصوص حالات میں اس کے دل پر کیا گذرتی ہے اس کا بیان اس نظم میں کافی حد تک ملتا ہے۔یہاں جو ''ہم'' ہیں، ''چوہے ہمارے خاندانی دوست ہیں''، یہ ''ہم'' بچے ہیں۔اور اگر حالات کے تناظر میں دیکھیں تو کمزور community ہے۔تو ''ہمارے'' لیے غرض بچوں کے لیے یہ سب ایک کھیل کی طرح ہو رہا ہے۔چوہے کا بھوک کترنا، پھر بھاگنا، پھر ماں کا جوتا پھینکنا اور چوہے کا صاف بچ نکلنا، ماں کو کہنا کہ ''چوہا تیرے کپڑے کُتر گیا'' اور ماں کا اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرنا، کیونکہ یہی وہ آخری جوڑا ہے جو اس نے زیب تن کر رکھا ہے، یہ سب بچوں کے لیے ایک کھیل سا ہے۔مگر ماں اس میں سنجیدہ دکھائی گئی ہے اور قدرے سخت بھی۔مثلاً ماں کا بچوں کو ''چپ ری سسری'' کہنا، ان تمام باتوں کا بہرحال ایک معنی ہے۔اس حصّے میں جب بچے ''ماں'' سے یہ پوچھتے ہیں کہ ''اماں ری چوہے کا گوشت کیسا ہوتا ہوگا'' تو ماں کا ڈانٹنا اور بتانا کہ ''ہم مسلمان ہیں''، اس حقیقتِ ازلی کی طرف اشارہ ہے کہ بھوکے پیٹ خُدا بھی نہیں ملتا اور یہ دین دھرم، مذہب اُس وقت تک ساتھ ہیں جب تک انسان کا پیٹ بھرا ہوا ہو۔غرض یہ کہ نظم میں اس طرح کے تلخ حقائق کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

نظم کا موضوع خارجی ہے مگر یہ نظم پوری کی پوری داخلی ہے۔ایک محروم انسان کے اندر کی کیفیات کا بیان ہے اور طبقاتی تفریق سے پیدا ہونے والی ناہمواریاں بیان کی گئی ہیں۔اس نظم میں سماجی پیچیدگی کے سبب پیدا ہونے والی ذاتی اُلجھن کا بھی بیان ہے کہ جس میں عورت کو تنہا دکھایا گیا ہے۔مرد کی موجودگی تو ہے مگر اس کی اس پورے منظر میں کوئی contribution نہیں ہے۔اس کا آخر میں آنا اور پھر چوہے دانی میں راکھ بھرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اتنی

روٹی بھی نہیں لا سکا کہ چوہے دان کو بھر سکے۔جب کہ عورت کا کردار مضبوط دکھایا گیا ہے کہ اتنے مصائب اور پریشانی کے باوجود بھی یاسیت یا افسردگی کے سے کلمات ادا نہیں کیے گئے ۔ یہاں ایک ترکیب جو استعمال ہوئی ہے وہ ہے ''لکڑی کی زبانیں'' ۔میری رائے کے مطابق اس سے قوتِ گویائی کے کم ہونے یا نہ ہونے کو مراد لیا گیا ہے ۔جب انسان کے پاس سب کچھ ختم ہو جاتا ہے تو اس کی بات بھی ختم ہو جاتی ہے،اور شاید یہ استعارہ اسی صورت حال کے لیے استعمال ہوا ہے ۔

نظم جمالیاتی سطح پر بھی کئی پہلو رکھتی ہے ۔نظم کا اسلوب اتنا سادہ اور معنی خیز ہے کہ جس کے باعث نظم میں ایک طرح کا داخلی آہنگ پایا جاتا ہے ۔الفاظ روزمرہ کے ہیں اور ان کے درمیان یعنی ''بین السطور'' ہی معنی پوشیدہ ہیں ۔مرکب الفاظ بھی استعمال کیے گئے ہیں اور صفات کا بیان بھی ہے ۔مثلاً مشترکہ درد کی خصوصیت بیان کرنے کے لیے جو صفت استعمال کی گئی ہے وہ ''شہوت انگیز'' ہے ۔یا ''چوہا بھوک کتر گیا'' ۔اب چوہا بھوک تو نہیں کترتا ،روٹی کھتا ہے،تو یہ بھی بطور استعارہ استعمال کیا گیا ہے ۔ایک امر جو قابل غور ہے وہ الفاظ کے چناؤ سے theme کی مطابقت ہے ۔مثلاً خود لفظ کترنا ایک خاص طرح کی کیفیت اور معنی رکھتا ہے کہ جس سے ہم چوہے کے بارے میں ہی سوچ سکتے ہیں ۔''بھوک کے دن عشق کے دن تھے،مگر ہم ان میں جی بھر کے نفرت کیا کرتے تھے''،یہ نوجوانی کے دن بیان کرنے کے لیے استعمال کی گئی ہے جہاں عشق کو نوجوانی کا استعارہ بنایا گیا ہے ۔پھر باپ کے آنے پر دیواروں کا لپکنا بھی خوشی کے استعارے کے طور پر لیا گیا ہے اور راکھ تو ہے ہی استعارہ loss or defeat کا۔پوری نظم ایک تصویری پیکر ہے اور اس میں بھرپور imagery ہے ۔جس سے اس کی aesthetic quality میں اضافہ ہوتا ہے ۔

نظریے کے اعتبار سے ترقی پسند نظریہ کہا جا سکتا ہے اور Marxisim میں غیر مساوی تقسیم مال اور اس کے اثرات کے حوالے سے بھی بحث کی جا سکتی ہے ۔مگر اس نظم کو صرف کسی ایک نظریے یا فلسفے تک محدود کرنا بھی نا انصافی ہوگی ۔بیان کردہ نکات کی روشنی میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ نظم معیار کے اعتبار سے ایک کامیاب نظم ہے اور شاعر نے احساسات اور جذبات کی ترجمانی موثر پیرائے میں کی ہے ۔

(سید عمار اختر کاظمی لمز کے طالب علم ہیں)

چوہے

چوہے ہمارے خاندانی دوست تھے
بُھوک کے کالے دنوں میں ہماری آبرو رکھتے
اور کبھی ہمارے گھر نہ آتے
لیکن کھلے دنوں میں اناج کی خوشبو ہمارے درمیان دشمن بن جاتی
ایک ہی روٹی چاروں تہیں کبھی ہماری نہ ہوئیں
چمکتی ہوئی گول گول حریص آنکھیں ہماری بُھوک آدھے میں سے کتر ڈالتیں
کبھی ہم روٹی ہاتھ سے چھوڑ دیتے
اور کبھی کسی چھوٹے کی کلائی اِتنی مضبوطی سے پکڑتے کہ روٹی خود بخود نیچے گر جاتی
حرامی.....سُوَر
مگر وہ سُوَر کبھی نہ بنتے چوہے ہی رہتے
ہمارے دن کاٹتے کاٹتے ہماری شہ رگوں تک آجاتے
اماں ری.....بولنے کیوں نہیں دیتی' میری روٹی چوہا لے گیا
اماں کاٹوتا اسکے پیچھے جاتا لیکن رفتار کا فرق ہمیں کبھی نہ جیتنے دیتا
اور ہم انکی کھائی ہوئی میں سے کھاتے
چُوہے دان ان دنوں روٹی سے مہنگا تھا
اور ہم چُوہوں سے زیادہ.....
ہماری آنکھیں بھی اتنی ہی چمکتی تھیں اور ہماری دُمیں نکلنے میں شاید کسی
بات کی دیر نہ تھی
بُھوک کے دن عشق کے دن تھے لیکن ہم ان دنوں
جی بھر کے نفرت کرتے تھے
سوتے میں دانت کچکچا کچکچا کر بُھوک اور بڑھا لیتے

یہاں تک کہ دانت کھٹے اور زباں کڑوی ہو جاتی
پتہ نہیں جسم کا نمک کہاں چلا گیا تھا
ورنہ کبھی کبھی اپنے ہی بازو کاٹ کر بڑا مزا آتا تھا
انکار کی ساری قوتیں دُم پر کھڑی ہو جاتیں اور ہم کبھی ہاں نہ کہتے
''نہیں'' کہنے سے آدھی بھوک مر جاتی
بھاری پلّو میں آنسوؤں کی ریزگاری بڑھ جاتی
بھاری پلّو میں اکنیاں نکالنے کے خواب کئی برسوں پر پھیل گئے تھے
اور اب اتنے دُھندلا گئے تھے کہ ان میں سے صرف چوہوں کی چمکتی
آنکھیں ہی دکھائی دیتی تھیں
بھوک کے وقفے لمبے ہو جاتے تو کبھی کبھی ہم میں صُلح ہو جاتی اور ہم
ان کے منہ سے روٹی کے ٹکڑے حاصل کرنے کے لیے دوست بن جاتے
انہی دنوں ہم نے گھات لگانا سیکھی
اور دوستی اور دشمنی کے اُصول طے کیے
جو شاید کھانے کے دنوں تک یاد نہ رہتے ہوں گے
پھر بھی ہماری آنکھیں ایک شہوت انگیز مشترکہ درد سے مُسکرا اُٹھیں
وہ مارا.....
نہیں نکل گیا..... روٹی چھوڑ کر نہیں بھاگا.....
پھر ہم نظر نہیں ملاتے تھے
اور کئی دنوں تک چُوہے بھی ادھر کا رُخ نہیں کرتے.....
''چوہوں کا گوشت کیسا ہوتا ہوگا''.....
''چُپ سُسری''.....
''ہم مسلمان ہیں' اماں ری اسے روک لے نا.....
اماں کا جُوتا آدھے راستے میں گر جاتا' ابھی بچوں اور چوہوں میں فرق باقی تھا

"اماں ری تیرے کپڑے چوہیا کاٹ گئی.....

اور وہ کپڑوں کی بجائے اپنا پیٹ ٹٹولنے لگتی

اسے معلوم تھا کہ کپڑوں کا آخری جوڑا تو وہ پہنے ہوئے ہے اور

اس کے بعد..... دن پھر نہیں پھریں گے.....

اندھیرا جو اُن دنوں چھانے لگا تھا پھر ہمارے حلق میں اُتر آیا

اور چوہے نظر آنے بند ہو گئے تھے

اور اب بھوکے رہنے کا مزا بھی جاتا رہا تھا.....

وقفوں میں چوہے غائب ہو جائیں تو شاید

دن رات کا فرق مٹ جاتا ہے

میں سب سے چھوٹا تھا اور ماں باپ کا فرق مٹانا سب سے پہلے میں نے

ہی شروع کیا تھا

پھر پانچوں بہن بھائی بھی اس کام میں لگ گئے

اور ہمیں ایک دوسرے کی خبر نہ رہی

کبھی کبھی کوئی کھانستا تو ہنسی آجاتی جیسے بند کانوں میں سے کوئی آواز

سنائی دے

گھوں گھوں..... کھوں کھوں..... اور بس

کوئی چکر قائم نہ ہوتا

دُھوئیں کے کھمبے ہمارے درمیان اُگنے لگے تھے

اور کھانسی ہمارے پاؤں کی اُنگلیوں میں محسوس ہوتی تھی

ہماری ساری پلکیں جھڑ چکی تھیں جس دن ہمارے دروازے پر دستک ہوئی

کوئی نہ اُٹھا.....

دروازہ کُھلا تھا.....

راکھ کے ڈھیروں میں اَدھ جلی لکڑی کی زبانیں

باپ لوٹا........تو دیواریں لپکیں
جلے ہوئے کاغذ جیسا دوپٹہ اماں کے سر سے سرک گیا
تیز آنکھوں والی چوہیا اسکے ماتھے پر روٹی کا ٹکڑا چھوڑ کر بھاگی
اور باپ
چوہے دان میں گھر کی راکھ بھرنے لگا.........

نمود، شمارہ ۳، ۲۰۱۴ء

محمد نعمان امین

افضال احمد سید کی نظم ''پھانسی'': تجزیہ

عصرِ حاضر کے بہترین اُردو شعرا کا تذکرہ کیا جائے تو افضال احمد سیّد کا نام اہم لوگوں میں ہو شامل ہوگا۔ اُن کی شاعری کی خوبی کا اندازہ اِس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کا نام اُن شعرا کی فہرست میں شامل ہوتا ہے، جن کے کام کا موازنہ بہترین جدید مغربی شعرا سے کیا جا سکتا ہے۔ افضال احمد سیّد کے ابتدائی مجموعوں چھینی ہوئی تاریخ (۱۹۸۴ء) اور خیمۂ سیاہ (۱۹۸۴ء) کو تنقید نگاروں کی طرف سے پُذیرائی حاصل ہوئی۔ دو زمانوں میں سزائے موت (۱۹۹۰ء) اور رو کو کو اور دوسری دُنیائیں (۱۹۹۹ء) بھی ان کی اہم کتابیں ہیں۔ ان کی نظم کی اثر انگیزی کی وجہ ان کا عصری شعور، ان کا بیانیہ اور تصویر کشی یا imagery ہیں۔

افضال سید کے خیالات ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کی علاحدگی اور ۱۹۷۴ء میں لبنانی اندرونی خانہ جنگی سے بہت متاثر ہوئے۔ ان کے مضامین میں غریبوں کا استحصال (''مٹی کی کان'')، طبقاتی تقسیم (''تم خوبصورت دائروں میں رہتی ہو'')، انسانی قدروں کی کمی (''ہمیں بھول جانا چاہیے'')، عورتوں کے ساتھ ہونے والی زیادتی (''زندہ رہنا ایک میکانیکی اذیت ہے'')، سیاسی جبر و بربریت (''اگر انھیں معلوم ہو جائے'' اور ''ایک دن اور زندہ رہ جاتا'') شامل ہیں۔ وہ کراچی کے رہنے والے ہیں۔ اس سے پہلے وہ بنگلہ دیش میں بھی قیام پذیر رہے۔ دونوں علاقوں میں اندرونی اور بیرونی طاقتوں کے موجب بہت نقصان پہنچا ہے اس لیے ریاست کے سائے میں پروان چڑھنے والی کرپشن اور دہشت گردی ان کے مضامین کا حصہ رہی۔ لیکن انھوں نے دوسرے موضوعات پر بھی لکھا ہے۔ ان کی غزلوں کے مجموعے خیمۂ سیاہ میں محبت کا موضوع بھی ملتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ موضوع ان کی

کچھ نظموں میں بھی ملتا ہے جیسا کہ ''تمھاری اُنگلیاں''۔جدید مسائل کے بارے میں بھی لکھا ہے اور کچھ تحریروں میں داخلی سفر بھی نظر آتا ہے (''ایک نئی زبان کا سیکھنا'' اور ''جس کا کوئی انتظار نہ کر رہا ہو'')۔

زیرِ غور نظم ''پھانسی'' میں ناانصافی، سماج کے بہیمانہ روّیوں، سیاسی جبر و بربریت کا ذکر ملتا ہے۔نظم میں پھانسی کے مختلف مراحل بیان کیے گئے ہیں جن سے ہوتا ہوا پھانسی پانے والا پھانسی کے تختے تک پہنچتا ہے۔ہر مرحلے پر اس کی ملاقات ایک کردار سے ہوتی ہے جو بالواسطہ یا بلاواسطہ اِس سارے عمل کا حصّہ ہے۔ساری نظم میں کہیں یہ ثابت نہیں ہو پاتا کہ پھانسی پانے والا واقعی کسی جُرم کا مرتکب ہے، بلکہ یہی تاثر ملتا ہے کہ وہ ایک گہری سازش کا شکار ہے اور اصل مجرم اور غلط کار وہ لوگ ہیں جو اِسے پھانسی دینے میں ملوّث ہیں۔اِس سفر میں بہت سے لوگ اُسے پھانسی پر لٹکتا دیکھنے کے مُنتظر ہیں لیکن جیسے ہی وہ پھانسی کے تختے پر پہنچتا ہے تو حکومت کی طرف سے تنخواہ بانٹنے والا آ جاتا ہے اور سب اُسے چھوڑ کر تنخواہ کی طرف بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔صرف پھانسی دینے والا وہاں موجود ہوتا ہے کیونکہ اُسے پھانسی پانے والے کی وردی سے غرض ہے، جو بعد از مرگ اس کے حصے میں آئے گی۔

اس نظم میں بیان کی گئی 'پھانسی' کو زندگی کے سفر سے بھی عبارت کیا جا سکتا ہے۔انسان عصرِ حاضر کے مسائل میں اس قدر گھر چکا ہے کہ زندگی ایک قید خانہ معلوم ہوتی ہے۔انسان زندگی میں اِس قدر پریشانیوں اور گھٹن کا شکار ہے جیسے وہ پھانسی کا سزا یافتہ ہو اور زندگی کا ہر مرحلہ اُسے موت سے قریب تر کرتا چلا جا رہا ہو۔عام آدمی ہر لمحے اذیت کا شکار ہے اور یہ اذیت اُسے معاشرے کے مختلف طبقوں سے ہی مِل رہی ہے۔اُس کی زندگی مشکل بنانے والوں میں اُس کے اِردگرد کے لوگ ہی شامل ہیں۔اور ان پے در پے مشکلات کے بعد انسان آخر موت سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔پورا معاشرہ بُرائیوں میں گھر چکا ہے۔ناانصافی، کرپشن، چوری اور سیاسی جبر انسان کے لیے زندگی کا دائرہ تنگ کرتے جا رہے ہیں۔افضال احمد سیّد نے اپنی بہت سی تحریروں میں اِس موضوع پر لکھا ہے کہ کس طرح ایک طبقہ دوسرے طبقے کا استحصال کرتا ہے اور اِس کو انحطاط کے گڑھے میں دھکیلتا چلا جاتا ہے۔افضال سیّد کی نظم ''مٹی کی کان'' میں بھی اِس کا تذکرہ ہے۔زیرِ غور نظم میں پھانسی پانے والا طبقہ، عام طبقہ ہے اور وہ تمام کردار جو اِسے پھانسی دینے میں ملوث ہیں دوسرے حکومتی اور معاشرتی عناصر ہیں جو اپنی اپنی حیثیت کے مطابق اُس پر حالات تنگ کر رہے ہیں۔

افضال احمد سیّد کے محبوب موضوعات میں سے ایک سیاسی جبر (political oppression) ہے۔ حکومتی بیوروکریسی، وطنیت کے جذبے کو کچلنے کے لیے مختلف ہتھکنڈے اِستعمال کرتی ہے اور وہ تمام عناصر جو اُن کے مفادات کی راہ میں حائل ہوتے ہیں اُنھیں موت کے گھاٹ اُتار دیتی ہے۔ اِس نقطۂ نظر سے وہ تمام کردار جن سے پھانسی پانے والا ملاقات کرتا ہے اِس نظام کا حصّہ ہیں۔ تمام ذرائع وعناصر جو حکومت کے خلاف کام کرنے والوں کو کچلنے کے لیے ضروری ہیں حکومت کے قبضے میں ہیں۔ پھانسی پانے والا وطن پسند فرد بھی ہوسکتا ہے یا بالکل عام انسان بھی۔ اگر اِس سے مُراد عام انسان ہے تو حکومت اپنی نااہلی، کرپشن اور چوری چکاری کو اِن لوگوں کی پھانسی کی آڑ میں چھپا لیتی ہے۔ یعنی سب غلط کاریوں میں تو حکومت ملوّث ہے لیکن اِن غلط کاریوں کی سزا پانے والا عام انسان ہے۔

شاعر نے نظم کے شروع میں ہی جس کردار سے قاری کی ملاقات کروائی ہے اُس نے نظم میں ایک شکنجے کا استعارہ پیدا کیا ہے۔ شکنجے کا استعارہ افضال صاحب کی ایک دو اور نظموں میں بھی ملتا ہے اور ہر جگہ اِس سے مراد ایسی شے ہے جس کی گرفت سے نکلنا ناممکن ہے۔ لوہار، چور اور کنویں میں دھکیلنے والے پھانسی کا سٹیج تیار کرنے والوں میں سے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت عام طبقے کو انحطاط کے گڑھے میں دھکیل رہے ہیں۔ قفل ساز، جُلاہا، اُس کی سوتیلی بہن اور دوسرے کارندے اُن کرداروں میں سے ہیں جو عام طبقے کو پھانسی تک پہنچانے میں دوسرے کرداروں کی مدد کر رہے ہیں۔ اِن تمام مراحل میں ہر کردار اپنے اپنے کام میں ماہر ہے۔ قفل ساز کا، قفل کی چابی پھانسی پانے والے کو دینا کرپشن کی طرف اشارہ ہے کیونکہ اصولاً یہ قانون کے خلاف ہے۔ اِس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اِس گڑھے سے، جس میں عام طبقے کو دھکیلا جا رہا ہے، بچ نکلنے کی طاقت اور حکومت اور دوسرے سازشی عناصر کے خلاف سر اُٹھانے کی قوت عام طبقے میں موجود تو ہے لیکن وہ اِس کو اپنے اندر ہی اندر دباتے چلے جا رہے ہیں۔

اِس نظم میں شاعر نے ریاستی ناانصافی اور بددیانتی کی بات کی ہے۔ مشرف فاروقی کے مطابق یہ اُن کے محبوب مضامین میں سے ہے جس کا ذکر انھوں نے روکو کو اور دوسری دُنیائیں کی بہت سی نظموں میں کیا ہے۔ وہ تمام عناصر جو پھانسی کے عمل میں شامل ہیں خود غلط کار ہیں۔ جس نظام کے تحت پھانسی دی جا رہی ہے اُس کی

بنیادیں کرپشن، چوری اور طبقاتی تقسیم پر قائم ہیں۔جلّاد وہ کردار ہے جو بالواسطہ یا بلا واسطہ حکومتی عناصر کی مدد کر رہا ہے۔سوتیلی بہن کے کردار میں ایک معصومیت اور بھولا پن ہے۔پانی پیتے ہوئے کنویں میں دھکیلنے کا مطلب ہے کہ پھانسی والے کے ساتھ دھوکا ہوا ہے اور دھوکے سے اُسے اِس سازش کا شکار بنایا گیا ہے۔پانی کے کنویں میں دھکیلنے میں تلمیح کا عُنصر بھی شامل ہوسکتا ہے کہ جیسے حضرت یوسفؑ کو دھوکے سے کنویں میں دھکیلا گیا تھا۔اگر اِس واقعے سے منسلک کیا جائے تو عام طبقے کی بے گناہی ثابت ہوتی ہے کہ وہ کسی گناہ کا مرتکب نہیں، محض دوسروں کی غلط کاریوں کا شکار ہے۔اِس بند میں ایک طرح کا طنز ہے۔شاعر کہتے ہیں کہ وہ ایک اور آدمی سے ملنے سے بچ گیا یعنی اگر دھکیلنے والا اور اشتہار لکھنے والا دو الگ ہوتے تو ایک اور آدمی سے ملنا پڑتا یعنی سازش کرنے والا اور جس کے پاس پھانسی کے اشتہار کا اختیار ہے دونوں ایک ہی ہیں۔حکومت اپنے اختیار کا غلط اِستعمال کرتی ہے اور عام طبقے کو نقصان پہنچاتی ہے۔شاعر کہتے ہیں کہ اِس عمل میں مزدوروں کو کم حیثیت ہونے کے باعث مجھ سے ملنے کی اجازت نہیں، یعنی طبقاتی تقسیم اس قدر ہمارے طبقے کا حصہ بن چکی ہے کہ ملاقات کے لیے بھی انھیں بلند حیثیت ہونے کی ضرورت ہے۔

اِس کے بعد شاعر ایک اور اہم خیال کا ذکر کرتے ہیں کہ جب انسان کو ہر طرف سے نا اُمیدی نظر آتی ہے، اپنے سامنے تمام دروازے اُسے بند نظر آتے ہیں تب اُسے خُدا کے وجود کا احساس ہوتا ہے۔پھانسی پانے والے کی آخری خواہش قومی ترانہ ہے جو اُس کی اپنے وطن سے محبت اور وطن پسند جذبے کا اظہار بھی ہوسکتی ہے اور ایک طرح کا حکومت پر طنز بھی کہ جس بنیاد پر وطن حاصل کیا گیا اُسے تو کب کی دیمک لگ چکی ہے لیکن بیوروکریسی کے قوانین کا عالم یہ ہے کہ اِس خواہش کی تکمیل کے لیے بھی اُسے دارالحکومت کی طرف سے اجازت کی ضرورت ہے۔ابھی تک پھانسی پانے والے کو یہ چیز حوصلہ دیے ہوئے تھی کہ کم از کم مرتے وقت لوگ اس کے اردگرد موجود ہوں گے لیکن کیونکہ یہ سب ایک سازش کا حصہ ہے اور حکومت اُس کی موت کو کوئی خاص واقعہ نہیں بنانا چاہتی، اس لیے اُس کی موت کی اہمیت کو ختم کرنے کے لیے بالکل اسی وقت تنخواہ بانٹنے والے آگئے ہیں۔یہاں پر عوام کی خودغرضی کو بھی دکھایا گیا ہے کہ لوگ اپنے ذاتی مفاد کو باقی چیزوں سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔معاشرتی منافقانہ طرزِ عمل کا ذکر ہے۔

شاعر ایک بڑے اہم جدید مسئلے کا ذکر کرتے ہیں جو کہ تنہائی ہے، کہتے ہیں کہ انسان اُس وقت تک تنہا ہے

جب تک وہ دوسروں کو فائدہ نہیں پہنچا رہا۔ ہمارے رشتے ناتے ذاتی اغراض و مقاصد تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔ اِس موضوع کا ذکر شاعر نے اپنی نظموں ''ایک نئی زبان کا سیکھنا'' اور ''جس کا کوئی انتظار نہ کر رہا ہو'' میں بھی کیا ہے۔ شاعر کو پھانسی دینے والا بھی صرف اِس غرض سے وہاں موجود ہے کہ پھانسی کے بعد اُسے پھانسی پانے والے کی وردی ملنا تھی۔ شاعر نے معاشرے کو حکومت کے ہاتھ کی کٹھ پُتلیاں دِکھایا ہے۔

نظم کا عنوان نظم سے خاص مطابقت رکھتا ہے اور نظم کو سمجھنے میں بھی معاونت کرتا ہے۔ نظم کا بنیادی خیال حکومتی کرپشن اور ناانصافی کا بیان ہے جس کی زد میں آ کر عام طبقہ موت کے گھاٹ اُتر جاتا ہے۔ خیالات کی رو میں ایک منطقی تسلسل میں ہے۔ شاعر مرحلہ بہ مرحلہ آگے بڑھتے ہیں اور کہیں خیالات کا تسلسل ٹوٹتا نہیں ہے۔ مجموعی تاثر میں نظم کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ پوری نظم میں افضال احمد سیّد کی زیادہ تر نظموں کی طرح خارجی عوامل زیادہ ملتے ہیں اور معاشرتی و سماجی مسائل اور حالاتِ حاضرہ کی واضح جھلک دِکھائی دیتی ہے۔ سیاسی کرپشن و ناانصافی اور طبقاتی تفریق ہی اس کے بُنیادی موضوعات ہیں۔ نظم میں عورت کا کردار موجود تو ہے لیکن وہ کردار کے انجانے پن اور بھولے پن کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ نظم کی سب سے بڑی خوبی کرداروں اور بیانیہ ساخت کا خوبصورت استعمال ہے۔ شاعر نے اِس پورے عمل کو اِس طرح بیان کیا ہے کہ قاری کے سامنے پھانسی کا ایک منظر بن جاتا ہے، جس میں پھانسی پانے والا مختلف کرداروں سے ملتا ہوا تختۂ دار تک پہنچتا ہے۔ کیونکہ نظم نثری پیرائے میں ہے، اِس لیے نغمگیت نہیں ہے بلکہ الفاظ کی ترتیب، کردار سازی اور معنویت ہی نظم کی اَصل خوبصورتی ہیں۔

(محمد نعمان امین لمز کے طالب علم ہیں)

کتابیات

۱۔ سید، افضال احمد۔ رو کو کو اور دوسری دنیائیں؛ منتخب نظمیں مترجم شرف علی فاروقی۔ Wesleyan Press، ۲۰۱۰ء۔

۲۔ _____۔ خیمۂ سیاہ۔ کراچی: احمد برادرز پرنٹرز، ۱۹۸۶ء۔

۳۔ _____-رو کو کو اور دوسری دنیائیں-کراچی: سٹی پریس بک شاپ، ۱۹۹۹ء۔
۴۔ _____-دو زبانوں میں سزائے موت-کراچی: ابن حسن پرنٹنگ پریس، ۱۹۹۰ء۔
۵۔ _____-چھینی ہوئی تاریخ-کراچی: مشہور آفسٹ پریس، ۱۹۸۴ء۔
۶۔ فاروقی، فوزیہ۔ ''دورِ حاضر کے شاعر: افضال احمد سید''۔ یونی ورسٹی اوف مشی گن۔

پھانسی

سب سے پہلے میں جس سے ملا
وہ ایک لوہار تھا
اس نے ایک دن میں
میرا شکنجہ اور پھانسی بنا دی تھی
مگر اسے قفل بنانا نہیں آتا تھا

اس کے ساتھ قفل ساز کھڑا تھا
جس نے میرا قفل فروخت کرنے کے بعد
اس کی کنجی مجھے بیچ دی تھی
جو میں اپنی جامہ تلاشی کے وقت نگل چکا تھا

اس کے آگے جو آدمی تھا
ایک چور تھا
جس نے وہ نہر چرائی تھی
جس میں لکڑی کے کندے پھانسی بنانے کے لیے بھگوئے گئے تھے

اس کے بعد وہ خالی جگہ تھی
جہاں لکڑی کے کندے دھوپ میں سخت کیے گئے تھے
خالی جگہ کے ساتھ وہ جُلاہا کھڑا تھا
جس کے تکلے پر وہ سُوت کاتا گیا
جس سے پھانسی پانے والے کی وردی بُنی تھی
جُلاہے کے ساتھ اس کی سوتیلی بہن کھڑی تھی
جو رسیاں بٹتے بٹتے پھانسی کی ڈور بٹ گئی تھی

اس سے آگے وہ آدمی کھڑا تھا
جس نے مجھے پانی پیتے ہوئے کنویں میں دھکیلا تھا
یہ وہی آدمی تھا
جس نے میری گرفتاری کا اشتہار لکھا تھا
اس طرح میں ایک آدمی سے ملنے سے بچ گیا

اس کے بعد کارندوں کے درمیان
وہ آدمی کھڑا تھا
جو مجھے پھانسی دینے پر مامور کیا گیا تھا
پھانسی کھڑی کرنے والے مزدور
جنھیں کم حیثیت ہونے کے سبب مجھ سے ملنے کے لیے قطار میں نہیں کھڑا کیا گیا
مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے

پھانسی دینے والے کے اور میرے درمیان بھی کوئی تھا
یہ خُدا تھا

آخری چیز جو میرے سامنے لائی گئی
میری آخری خواہش تھی
میں نے کہا میرے مرنے پر قومی ترانہ بجوا دیا جائے
مجھے پھانسی دینے والے نے وعدہ کیا کہ وہ ضرور دارالحکومت کو قومی ترانے
کی ایک نقل کے لیے لکھے گا

اتنے میں شور مچ گیا کہ
دارالحکومت سے تنخواہ بانٹنے کے لیے کارندے آ گئے ہیں
قطار میں کھڑے تمام لوگوں میں ہلچل مچ گئی

صرف مجھے پھانسی دینے والا مجھے لے کر آگے بڑھا
کیونکہ نئے احکامات کے تحت پھانسی پانے والے کے کپڑے
پھانسی دینے والے کو مل جاتے ہیں

مرتے وقت پھانسی دینے والے کے سوا
میرے پاس کوئی اور نہ تھا
کاش دارالحکومت سے تنخواہ اس دن نہ آتی

ولید خان

''اوورکوٹ'': غلام عباس اور گوگول کے افسانوں کا موازنہ

گوگول کا افسانہ ''اوورکوٹ'' ایک عام شخص اکاکی اکیکوچ (Akakiy Akakievitch) کی کہانی کو منظرِ عام پر لاتا ہے۔ایک ایسا شخص جو کہ خاموشی سے اپنی زندگی بسر کررہا ہے۔سرکاری ملازم ہے۔اسی ادارے کی ایک کرسی پر وہ اپنی طویل زندگی گذار دیتا ہے۔اتنا عرصہ گذارنے کے باوجود بھی اسے کوئی بھی اس دفتر میں نہیں پہچانتا۔وہ بھی دفتر میں پڑی ہوئی مشینوں کی طرح ہوتا ہے جو کہ بڑے عرصے تک پڑی رہتی ہیں۔دفتر میں اس کی سادگی کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔اس کی خاموشی ہی لوگوں کے نزدیک اس کی کمزوری تھی۔روز ایک ہی طرح کا پھٹا ہوا لباس پہن کر آتا تھا۔اس کو ایک ہی کام آتا تھا۔اوراق کو کاپی کرنا۔اس کے علاوہ اس کا کوئی کام نہ تھا۔وہ بھی دفتر کا ایک tool ہی تھا اور اس کے علاوہ اس کی کوئی حیثیت نہ تھی۔کہانی کے اصل باب کا آغاز تب ہوتا ہے جب 'اکاکی' کو محسوس ہوتا ہے کہ اس کا ''اوورکوٹ'' اب پہننے کے قابل نہیں رہا اور اسے اس ''اوورکوٹ'' میں ٹھنڈ لگ رہی ہے۔وہ ''اوورکوٹ'' کو اتار کر اس کا جائزہ لیتا ہے۔اسے محسوس ہوتا ہے کہ اب وہ اوورکوٹ کہلانے کے قابل نہیں رہا۔وہ مرمت کروانے کی سوچتا ہے اور اپنے پڑوسی درزی، پیٹروِیچ (Petrovitch)، کے پاس جاتا ہے جس سے اس کی جان پہچان ہوتی ہے۔'اکاکی'، 'پیٹروِیچ' کے پاس اپنا اوورکوٹ لے کر جاتا ہے۔درزی اسے سینے سے انکار کر دیتا ہے۔اس کے نزدیک اب یہ اوورکوٹ مرمت کے قابل نہیں رہا ہوتا۔پیٹروِیچ اسے نیا اوورکوٹ خریدنے کا مشورہ دیتا ہے، جس کی قیمت 'اکاکی' کے نزدیک ایک سال کا فاقہ ہوتی ہے۔وہ سوچتا ہے کہ اب اسے ایک سال تک بچت کرنا پڑے گی۔موم بتی کا کم استعمال اور رات کا کھانا بھی گول کرنا پڑے گا۔'اکاکی' کی اب ایک ہی خواہش ہوتی ہے

کہ وہ نیا اوورکوٹ خریدے۔ آخر کپڑا خریدا جاتا ہے۔ ہوتے ہوتے اوورکوٹ تیار ہو جاتا ہے۔ اوورکوٹ پہننے کے بعد لوگ اسے اہمیت دینے لگتے ہیں۔ سب اسے مبارک باد دیتے ہیں اور وہ رات کے کھانے پر بلایا جاتا ہے۔ کھانے پر بھی 'اکاکی' کے اوورکوٹ کا چرچہ ہوتا ہے۔ گھر واپسی پر چند لوگ اس کا اوورکوٹ چھین لیتے ہیں۔ اوورکوٹ، جو کہ اکاکی کی زندگی کا اب ایک اہم اثاثہ ہوتا ہے لٹ جاتا ہے۔ اب اس کی تمام خواہشات اس اوورکوٹ کے ساتھ ختم ہو جاتی ہیں۔ اس کی حالت دیکھ کر سپرنٹنڈنٹ اور سرکاری عہدیدار بھی اسے اہمیت نہیں دیتے اور اس کا اوورکوٹ تلاش نہیں کرتے۔ اکاکی بیمار پڑ کر مر جاتا ہے اور اس کی موت کے ساتھ ایک اور عام آدمی غائب ہو جاتا ہے۔ دفتر والوں کو کئی دنوں بعد تب پتا چلتا ہے جب وہ کسی شخص کو اکاکی کو بلانے کے لیے بھیجتے ہیں اور اس کے بعد دنیا کے دستور کے مطابق اگلے دن اکاکی کی جگہ کوئی اور اس کرسی پر بیٹھا ہوتا ہے۔

گوگول کے افسانے میں ہمیں عام آدمی کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس افسانے کے مطابق اس معاشرے میں اسی آدمی کی اہمیت ہوتی ہے جو کہ عام نہ ہو۔ دنیا انسان کے مالی اور سماجی حالات کی بنا پر اسے اہمیت دیتی ہے۔ یہ وہ پیمانہ ہے جس سے دنیا اپنی بے حسی کا اظہار کرتی ہے۔ گوگول کے افسانے کا کردار بھی ایسا ہی عام آدمی ہے۔ یہ وہ شخص ہے جو ہمارے دفاتر میں کام کرتا ہے اور ہمارا نظام چلاتا ہے اور غربت میں اپنی زندگی بسر کر دیتا ہے۔

ہم ہر جگہ سنتے ہیں کہ انسان کو اس کے ظاہر سے نہیں بلکہ اس کے باطنی کردار سے پہچانو۔ لیکن حقیقت میں انسان کو اس کے ظاہر سے پہچانا جاتا ہے۔ اگر کسی کا ظاہر اچھا ہو تو لوگ اس کی آؤ بھگت کرتے ہیں۔ ظاہر سے مراد دنیاوی دولت ہے۔ گوگول کے افسانے میں ہمیں نظر آتا ہے کہ کیسے ایک عام آدمی ایک ہی کپڑے یا لباس میں اپنی پوری زندگی گذار دیتا ہے۔ دنیا کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ دنیا کے نزدیک وہ ایک سادہ سا شخص ہے جسے وہ ایک مزاح کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

اگر ہم اپنے گرد نظر دوڑائیں تو ہمیں نظر آئے گا کہ یہ صرف ایک 'اکاکی' نامی شخص نہیں جو کہ ایسی زندگی بسر کر رہا ہے بلکہ ہمارا معاشرہ بھی ایسے لوگوں سے بھرا پڑا ہے جو ایسی ہی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں اکاکی جیسے لوگ پہیوں کا کام کر رہے ہیں۔ پہیہ صرف گھومتا رہتا ہے لیکن کسی کو اس کی اہمیت کا اندازہ نہیں۔

اکا کی جیسے لوگ ہمارا نظام چلاتے ہیں۔اکا کی جیسے لوگ خاموشی سے آتے ہیں،اپنا کام کرتے ہیں، گذر جاتے ہیں۔ان سے کام لینے والے کبھی بھی ان کو ان کے کام کے مطابق عزت نہیں دیتے۔پہیے تبدیل ہوتے جاتے ہیں اور گاڑی چلتی جاتی ہے۔

غلام عباس کے افسانے میں ہمیں ایک غریب شخص ہی نظر آتا ہے مگر وہ ایک مختلف روپ دھارے ہوتا ہے۔اس افسانے میں ہمارے سامنے دو طرح کے لوگ آتے ہیں۔ایک وہ لوگ جو کہ دنیا کے ڈر سے خود کو چھپائے ہوئے بیٹھے ہیں۔دوسرے وہ لوگ جو اپنا ظاہری روپ دکھاتے پھرتے ہیں۔جو کہ ان کا اصل نہیں ہوتا۔یہ دونوں لوگ ایک بھی ہو سکتے ہیں۔یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اوورکوٹ والا نوجوان اپنے اصل کی وجہ سے اتنا ستایا گیا ہو کہ اس نے ٹھان لی کہ اب وہ دنیا کے سامنے اپنا اصل نہیں رکھے گا۔دنیا ایک فریب ہے اور ہر کوئی ایک دوسرے کو فریب دینے میں لگا ہوا ہے۔اوورکوٹ میں چھپا شخص اس معاشرے کے فریب کا شکار ہو کر خود بھی فریبی معاشرے میں شامل ہو گیا ہے۔غلام عباس نے اس کردار میں ہمارے معاشرے کا پورا عکس دکھا دیا ہے۔غلام عباس نے ظاہر میں ہمارے معاشرے کے بارے میں کچھ نہیں لکھا مگر ایک شخص اور ایک واقعے کے بیان سے تصویر کے نئے پہلو سامنے آئے ہیں۔

فنی و فکری تجزیہ:

فنی اعتبار سے اگر ہم دونوں افسانوں کا جائزہ لیں اور ان کا موازنہ کریں تو ہمیں چند چیزیں سامنے رکھنا پڑیں گی۔ایک تو یہ کہ غلام عباس کا ''اوورکوٹ'' اردو میں لکھا گیا اور اسی وجہ سے ہمارے لیے اس کا جائزہ اردو ادب کے لحاظ سے آسان ہوگا۔ہم اس کا موازنہ اردو ادب سے کر سکتے ہیں۔مگر کوکول کا افسانہ روسی زبان میں لکھا گیا اور جو ہم تک پہنچا وہ اس افسانے کی انگریزی شکل تھی۔کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جو مزہ اور حقیقت اصل میں ہوتی ہے،ترجمہ وہ چیز اتنے موثر طریقے سے نہیں پیش کر سکتے۔اس کے باوجود بھی اگر ہم دونوں افسانوں کا موازنہ کریں تو ہمیں دونوں افسانوں میں فنی لحاظ سے فرق نظر آئے گا۔اس کے برعکس اگر فکری سطح پر جائزہ کیا جائے تو ہمیں دونوں افسانوں میں مماثلت نظر آتی ہے۔

اگر ہم زبان کے لحاظ سے دیکھیں تو غلام عباس کے افسانے اوورکوٹ میں ہمیں نہایت سادہ زبان نظر آتی

ہے۔غلام عباس کی سادہ اور آسان زبان میں معاشرے کے کئی اہم پہلو اجاگر ہو گئے ہیں ۔غلام عباس کم الفاظ میں بہت کچھ کہہ گئے ہیں۔ جوبات کوکول کو سمجھانے میں بہت طویل وقت لگا،اسے غلام عباس نے تین اوراق میں لکھ ڈالا جب کہ کوکول نے بتیس اوراق کا سہارالیا۔ گویا دونوں افسانوں میں ہمیں تفصیلات نظر آتی ہیں مگر غلام عباس کے افسانے کی جوتفصیلات تھیں وہ کردار کے ہر ایک پہلو کواجاگر کررہی تھی۔غلام عباس نے اتنے ہی الفاظ استعمال کیے جتنے ان کے نزدیک ضروری تھے۔

ولادیمر نبکوو(Vladimir Nabokov)، کوکول کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اگر ہم کوکول کوایک آرٹسٹ سمجھ کرپڑھتے ہیں تو ہم پر یہ بات عیاں ہوگی کہ جب بھی کوکول نے ایک روایتی ادبی انداز میں کچھ لکھنے کی کوشش کی تو وہ اپنا اصل آرٹ دنیا کے سامنے نہیں لا سکا۔مگر''اوورکوٹ''میں کوکول نے خودکوایک آزاد نظم لکھنے والے شاعر کی طرح ایک تسلسل میں جانے دیا۔کوکول کسی روایتی ادب کے بندھن سے ہٹ کر جب لکھنے لگےاوراپنے اندرونی وجود کوہوبہو باہر پیش کرنے لگےتو ہمارے سامنے روسی ادب کا سب سے بڑا آرٹسٹ پیش ہوا۔مطلب یہ کہ کوکول ایک ایسا آرٹسٹ ہے، جواپنے دل کی بات کو بیان کر رہا ہے۔ جہاں اس کا دل چاہا اس نے اس بات کوطویل کر دیا، جہاں چاہاختم کردیا۔یہی چیز ہمیں غلام عباس کےافسانوں میں بھی نظر آتی ہے۔غلام عباس نے اتنی ہی بات کی جتنی مناسب تھی۔اس افسانے کی خوبصورتی یہ ہے کہ ایک ہی واقعے میں غلام عباس بہت سے اہم پہلو سامنے لے آئے ہیں۔نہ صرف یہ کہ افسانہ پڑھنے والے کولطف دیتا ہے بلکہ اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور بھی کر دیتا ہے۔غلام عباس ظاہر میں کسی چیز پر تنقید نہیں کرتے مگر پسِ پردہ بہت سی معاشی اقدار پر کاری ضرب لگائی ہے۔غلام عباس نے روایتی انداز کے بجائے اپنے انداز میں لکھا ہے۔

کردار:

اگر ہم معاشرے کے نچلے درجے کے لوگوں پر نظر دوڑائیں جنھیں ہم مڈل کلاس یا لوئر مڈل کلاس کا ٹیگ لگاتے ہیں تو ہمیں دونوں افسانوں کے مرکزی کردار نظر آئیں گے۔احساس کمتری معاشرے کے ان دونوں ہی کرداروں میں نظر آتی ہے۔اکاکی پر اگر ہم غور کریں تو ہمیں معاشرے کا وہ عام شخص نظر آئے گا جو کہ اپنے کام میں مگن

ہے۔وہ اپنی ضروریات پوری کرنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔وہ کسی غیر ضروری خواہش کا طابع نہیں۔اس کردار میں ہمیں ان سب لوگوں کی جھلک نظر آتی ہے جو روز دفتر کے لیے جاتے ہیں اور ان کی زندگی دن اور رات کی طرح اسی ایک تسلسل میں چلتی جارہی ہے۔ضروریات اتنی کم ہونے کے باوجود بھی ایسے شخص کے لیے معاشرے میں جگہ بہت کم ہے۔وہ اپنی ضروریات پوری نہیں کرسکتا۔ایک کرسی پر وہ اپنی ساری زندگی بسر کردیتا ہے۔مگر کسی کا دھیان اس کی طرف نہیں ہوتا۔معاشرتی نظام کی خرابی کا ہم یہاں سے اندازہ لگاسکتے ہیں کہ اکا کی جیسا شخص جو کہ سرکاری ملازم ہے اور اپنی پوری عمر اسی ملازمت میں لگاتا ہے، جب اسے ایک نئے اوورکوٹ کی ضرورت پڑتی ہے تو ایک اوورکوٹ کے لیے اسے ایک سال کا فاقہ کرنا پڑتا ہے۔چائے پینا چھوڑ دینا، موم بتی کا استعمال کم کرنا اور اکثر رات کا کھانا چھوڑنا پڑتا ہے۔ایسے میں سوال اٹھتا ہے کہ ایک انسان یہ ذلت کیوں سہتا ہے؟ کیا ہمارا معاشرہ ان ہی لوگوں کا ہے جو کہ سرمایہ دار ہیں؟ انسان کے کام، کردار اور محنت کی کوئی قیمت نہیں؟

(ولید خان لمز کے طالب علم ہیں)

منیرؔ اس ملک پر آسیب کا سایہ ہے یا کیا ہے؟
کہ حرکت تیز تر ہے اور سفر آہستہ آہستہ

منیرؔ نیازی

سدرہ خان

مورتیوں کا بازار

وہ رو رہی تھی، مکمل طور پر ٹوٹ چکی تھی۔ بھیگی پلکیں اور بکھرے بال لیے سسکیوں سے نڈھال ہو چکی تھی۔ میں وہاں دور، بہت دور کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ بھلا میں اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ کیا میں اس سب کی وجہ تھا؟ یا پھر یہ خود اس کی ذمہ داری تھی؟ یا شاید ہم دونوں اپنی جگہ بے قصور تھے اور فرق محض اتنا تھا کہ وہ یہ سب سہہ رہی تھی جب کہ میں بے بس دور کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔۔۔

.....

جب میں یہاں نیا نیا آیا تھا تو یہ سب مجھے بہت حیران کن لگا کرتا تھا۔ اس شہر کا رنگ ہی اور تھا۔ ہر طرف رونق اور ہر دل خوشحال معلوم ہوتا تھا۔ مجھے یہ سب اچھا لگنے لگا تھا۔ اس فضا نے تو مجھ پر جیسے جادو سا کر دیا تھا۔ مجھے لگنے لگا تھا کہ جیسے میری زندگی تو اب یہاں آ کر شروع ہوئی تھی۔

یہاں کی ایک چیز مجھے بہت الگ لگا کرتی تھی۔ باقی سب طرح کے بازار اور دکانیں تو میں نے پہلے بھی دیکھ رکھی تھیں مگر یہاں کچھ نئے اور الگ قسم کے بازار تھے۔ ان بازاروں میں خوبصورت مورتیوں سے بھری دکانیں اور ان دکانوں کے باہر خریداروں کی ایک لمبی قطار۔

اس شہر کے آٹے میں نمک برابر بت پرستوں کے لیے اتنے بڑے بازار میری سمجھ سے باہر تھے اور اوپر سے نہ تو یہ دکانیں معمولی تھیں اور نہ ہی یہاں بکنے والے بت۔۔۔ میں نے بت پرستوں کو بتوں کی پوجا کرتے دیکھا تھا، اس لیے ان کے بتوں کی عجیب و غریب اور غیر انسانی شکلوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ مگر یہ کیا تھا؟ یہاں تو انسان نما

بت تھے۔ ہر روپ اور ہر ڈھنگ میں ڈھلے ہوئے۔ شاید خریداروں کی لمبی قطاروں کا سبب یہی مختلف اقسام کے بتوں کی فراوانی تھی۔ خیر یہ جو بھی تھا، مجھے کسی حد تک بھلا لگنے لگا تھا۔ آخر بڑے شہروں کے ڈھنگ بھی بڑے ہوا کرتے ہیں۔

میں نے بہت تھوڑے عرصے میں ایک اچھی جگہ نوکری تلاش کر لی تھی۔ دفتر تھوڑا دور تھا مگر چونکہ اس کا راستہ اس طرح کے ایک بازار سے ہو کر گذرتا تھا، اس لیے یہ خاصا لمبا سفر بھی اس بازار کے انتظار میں منٹوں میں گذر جایا کرتا تھا۔ دفتر میں سب بہت اچھے تھے اور وہاں بھی ان بازاروں کی خریدی ہوئی مورتیاں رکھی گئی تھیں۔ جتنے سلیقے سے ہر مورتی اپنی جگہ رکھی گئی تھی، میں اسے دیکھ کر حیران تھا۔ شاید وہ اس سے بہتر اور اس سے اچھے انداز میں نہیں رکھی جا سکتی تھی۔ اب تو مجھے بھی اس مختصر عرصے میں اس کا تھوڑا تھوڑا سلیقہ آنے لگا تھا۔ ان کا استعمال اور فائدہ دیکھ دیکھ کر میں بھی کچھ حد تک یہ سب سیکھ گیا تھا۔ نہ جانے کیوں ایک عجیب سی خوشی محسوس ہونے لگی تھی۔ شاید اس لیے کیونکہ کبھی مجھے یہ لگا کرتا تھا کہ یہ میرے جیسے سادہ بندے کے بس کا کام نہ تھا۔ مگر اب میں بھی ماہر ہونے لگا تھا اور میرا خواب بھی کچھ ایسا ہی کرنے کا تھا، جو مجھے اب میری منزل کے قریب لے کر جا رہا تھا۔ شاید مجھے اپنی اس کامیابی کا احساس نہ ہوتا اگر اس دن مجھے وہ لڑکی وہاں بازار میں اس طرح کھڑی نہ ملتی ۔۔۔

کچھ عجیب سا تھا اس لڑکی میں، بلا کا حسن نہ ہونے کے باوجود بھی وہ اس پریشان حالی میں بہت حسین معلوم ہو رہی تھی۔ نہ جانے کیوں وہ اس بازار میں اور اس رش میں اکتائی ہوئی لگ رہی تھی جب کہ اس دن تو وہاں نسبتاً رش کم تھا۔ اسے دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ پہلی بار اس بازار میں آئی تھی۔ اس خیال نے مجھے حیران سا کر دیا۔ بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ اس شہر کا رہنے والا کوئی شخص اس بازار کی خرید و فروخت سے دور رہا ہو، مگر اس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ پہلے کبھی یہاں خریداری کے لیے نہیں آئی تھی۔ اس کی پریشان حالی سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کئی گھنٹوں سے کسی چیز کی تلاش میں تھی جو کہ اسے اب تک نہیں ملی تھی۔ اس نے ایک دو لوگوں کو روک کر کسی چیز کے بارے میں پوچھا بھی، مگر وہ سب ہنس کر چل دیے ۔۔۔ میرا دل چاہا کہ رک کر اس کی اس پریشانی کا سبب پوچھوں مگر چونکہ مجھے دفتر سے دیر ہو رہی تھی، اس لیے رک نہ سکا۔ راستے میں مجھے اس کا خیال رہا مگر دفتر پہنچتے ہی کام میں اتنا گم ہو گیا کہ اسے بھول گیا۔ دن

گذرتے گئے اور میں اپنی مصروفیتوں میں اتنا مگن رہا کہ کبھی پلٹ کر اس لڑکی کا خیال نہ آیا۔

پھر ایک دن دفتر سے واپسی پر وہ لڑکی اسی طرح پریشان حال مجھے وہاں کھڑی ہوئی ملی۔ میں اس کے پاس رکا۔ میں نے نرم لہجے میں اس سے اس کی پریشانی کی وجہ پوچھی۔ اس نے مجھ سے بھی وہی سوال کیا جو شاید وہ باقی سب سے کیا کرتی تھی۔ بازار میں بہت رش تھا اور ہر ایک دکان پر جا کر اس شے کو ڈھونڈنا مشکل تھا، جو اسے چاہیے تھی۔ میں نے اس سے گھر جانے کو کہا اور وعدہ کیا کہ کل صبح میں اس کے ساتھ بازار کی ایک ایک دکان پر وہ شے تلاش کروں گا۔ وہ اسی پریشان حالی میں وہاں سے چل دی۔ مگر اب اس کی آنکھوں میں ایک امید پیدا ہو گئی تھی۔

اگلی صبح وعدے کے مطابق میں دفتر کے بجائے وہاں بازار میں اسی جگہ رک گیا اور اس کا انتظار کرنے لگا۔ میں بازار کی رونق سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ وہ وہاں پہنچ گئی اور ہم دونوں اس شے کی تلاش میں نکل پڑے۔ اک مورتی کی تلاش ۔۔۔ اس لڑکی کی مورتی کی ۔۔۔

ہم نے اپنی تلاش بازار کے ایک سرے سے شروع کی اور ایک ایک دکان پر جا کر اسے ڈھونڈنے لگے۔ وہاں دکانوں میں تلاش کے دوران میں نے اپنے جاننے والے کئی لوگوں کی مورتیاں دیکھیں۔ ہو بہو ان جیسی مورتیاں ۔۔۔

وہاں مورتیوں کی تعداد دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ دنیا کا کوئی شخص ایسا نہ ہوگا جس کی مورتی وہاں نہ پائی جائے۔ مگر اس لڑکی کی مورتی تھی کہ ملنے کا نام نہ لیتی تھی۔ ہم نے آدھا بازار چھان مارا مگر کہیں اس کا نام و نشان نہ ملا۔ اب شدید گرمی کی وجہ سے ہم دونوں بہت تھک چکے تھے۔ ستانے کی خاطر ایک شربت کی دکان پر رکے اور میں نے شربت کے دو گلاس منگوائے۔ پھر میں نے اس لڑکی کی پریشان حال صورت دیکھی تو اس سے پوچھا، ''تمھیں اپنی مورتی کیوں چاہیے؟''

''بھلا مجھے اپنی مورتی کا کیا کرنا۔ مجھ سے وابستہ چند لوگوں کو چاہیے۔''

''تو اگر تمھاری مورتی نہ بھی ملے تو کہہ دینا ان سے کہ بازار میں نہ تھی۔''

''وہ لوگ مجھے قبول نہیں کریں گے۔''

''ارے! یہ کیا بات ہوئی؟ ایسا بھی کیا ہو گیا آخر!؟''

''تم پوچھتے ہو ایسا کیا ہو گیا۔۔۔؟ کیا تمھیں یہاں کی رسم کا نہیں پتا؟''

''رسم؟؟ کیسی رسم؟''

یہ سن کر اس نے نہایت معصومیت سے مجھے دیکھا اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میں نے اسے حوصلہ دیا اور امید دلائی کہ میں بازار کی ایک دکان بھی نہ چھوڑوں گا اور یہاں سے اس کی مورتی ضرور دلاؤں گا۔ ہم نے پھر سے اپنی تلاش شروع کر دی۔ اب کی بار ہم جس دکان میں گئے وہاں اور بہت سے جاننے والوں کے ساتھ مجھے اپنی مورتی بھی پڑی ہوئی دکھائی دی۔ اس مورتی کو دیکھ کر مجھے عجیب سی خوشی اور اطمینان ہوا۔ وہ جو بھی رسم تھی، میں نے اسے پورا کر لیا تھا۔ مجھے فخر بھی ہوا کہ میں نے اتنے کم عرصے میں اس انجان شہر میں اپنی جگہ بنا لی تھی۔ گویا مجھے لگا کہ میں تو کامیاب ہو گیا مگر اب تک اپنی اس کامیابی سے لاعلم رہا۔ لیکن یہ وقت خوشی منانے کا نہ تھا۔ بازار ختم ہونے کو تھا اور اب تک اس لڑکی کی مورتی کسی دکان پر نہ ملی تھی۔ میں بری طرح تھک چکا تھا۔ اور اب تو مجھے اس کی مورتی ملنے کی امید بھی نہ رہی تھی کیونکہ اب تک جس کی مورتی میں نے اس بازار میں دیکھی تھی وہ کئی دکانوں پر تھوڑے بہت ردوبدل کے ساتھ بار بار نظر آئی تھی۔ ایک نہ تھی، تو اس کی ہی نہ تھی اور آگے کی چند دکانوں میں بھی اس کے ملنے کی کوئی امید نہ تھی۔ اس لیے میں نے اس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے اسے آگے کی دکانیں اکیلے دیکھنے کے لیے بھیج دیا۔ وہ معصوم سب دکانوں پر ان تمام مورتیوں کے بیچ اپنی مورتی ڈھونڈتی پھری مگر نا کام رہی۔ اب بس ایک آخری دکان رہ گئی تھی۔ وہ ایک آخری امید لیے اس دکان میں داخل ہوئی۔ اس نے دکان کا ایک ایک کونا چھان مارا کہ شاید کہیں اسے اپنی مورتی نظر آ جائے مگر اس کی وہ امید بھی ٹوٹ گئی۔ وہ دکان سے باہر نکلی اور آبدیدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے نظریں جھکا لیں۔ اس نے روتے ہوئے دکاندار سے ایک آخری سوال کیا۔

''آخر میری مورتی کیوں کسی دکان میں نہیں رکھی گئی؟''

''بی بی! جو بکتا نہیں اسے رکھ کر ہم کو کیا کرنا۔۔۔''

دکاندار نے سختی سے جواب دیا۔وہ وہیں زمین پر نڈھال بیٹھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور میں دور، بہت دور کھڑا اسے دیکھتا رہا۔۔۔

(سدرہ خان لمز کی طالب علم ہیں)

یہ ایک ابر کا ٹکڑا کہاں کہاں برسے
تمام دشت ہی پیاسا دکھائی دیتا ہے

نہ اتنی تیز چلے سر پھری ہوا سے کہو
شجر پہ ایک ہی پتا دکھائی دیتا ہے

شکیب جلالی

نمود، شمارہ ۳، ۲۰۱۴ء

علی امین

کِرانا

ہم دونوں بھائیوں کو عید کی چھٹیاں ہو چکی تھیں اور ہمیں دادا جان کے خط کا انتظار تھا۔ ہمارے گھر ٹیلی فون ہوتا تھا مگر پھر بھی دادا جی ہمیں ہمیشہ خط لکھ کر ہی بلایا کرتے تھے۔ شاید ان کو خط لکھنا پسند تھا۔ خیر ہمیں ایک دن خط پہنچ ہی گیا۔ ہم بہت خوش تھے کہ ہم چھ چک جانے لگے ہیں۔ والد صاحب کی دکان عام طور پر تو نہیں چلتی تھی اور روزامی جان پوچھتی تھیں: ''آج کچھ ہے''؟ تو وہ کہتے: ''میرے کول تے اللہ داناں اے''۔ لیکن اس خط کے ملنے کے اگلے روز ہی ان کے پاس اللہ کا نام اور ہم سب کے کرائے کی رقم اکھٹی ہو جاتی تھی اور ہم اپنے کپڑے بیگ میں ڈال سرگودھا کے لیے روانہ ہو جاتے تھے۔ اس بار بھی یونہی ہوا۔ ہم تین بھائی، ابا جی، امی اور ہمارے چچا بس میں بیٹھ کر سرگودھا کو روانہ ہو گئے۔ پہلے ہم جی ٹی روڈ سے جاتے تھے لیکن جب سے موٹروے بنی تھی سفر کا مزہ نہیں آتا تھا۔ دو گھنٹے میں ہی ہم سرگودھا پہنچ جاتے تھے اور وہ بھی خاموشی سے گذرتے تھے۔ بس میں نیند آ جاتی تھی۔ نہ کوئی نان پکوڑوں والا، نہ کوئی منجن والا اور نہ کوئی سرمے والا۔ سفر کا مزہ ہی نہیں آتا تھا۔ موٹروے جونہی ختم ہوتی تو اصلی دنیا شروع ہو جاتی تھی۔ نان پکوڑوں والے، مکئی کے سٹوں والے بس میں آ جاتے تھے اور ہم والد صاحب سے بڑی ضد کر کے کچھ نہ کچھ لے لیا کرتے تھے۔ یہاں سے آگے ضلع سرگودھا کی حدود شروع ہو جاتی تھیں۔ سڑک بھی گڑھوں والی اور کم چوڑی ہو جاتی تھی اور اس پر ڈرائیونگ کرنا بہت خطرناک لگتا تھا۔ مگر مجھے یہ سڑک بہت پسند تھی کیونکہ اب نیند نہیں آتی تھی۔ میں بس کی کھڑکی میں لگے پائپ سے ٹکرا جاتا مگر میں پرواہ نہ کرتا تھا۔ دائیں طرف تھوڑی بلندی پر اسی سڑک کے ساتھ ساتھ موٹروے چلتی جاتی تھی اور تھوڑا آگے جا کر دریائے چناب کے پل کے بعد دونوں سڑکیں

الگ ہو جاتی تھیں۔اب ہماری سڑک کے دونوں طرف کھیت آجاتے تھے۔ان کی طرف میں زیادہ توجہ نہیں دیتا تھا۔ اوراس دوران میرا ذہن چھ چک میں اپنے گھر کی طرف چلا جاتا تھا۔اور میں اس کی باتیں سوچتا تھا یا عمیر سے کچھ لے کر کھاتا تھا۔کوئی دس منٹ اسی طرح چلنے کے بعد بس ایک جگہ رکتی تھی۔یہ چک چھیاسی کا سٹاپ تھا۔یہاں سے آگے جو سڑک تھی اس کے دونوں اطراف کینو کے باغ تھے۔جو سردیوں میں پھل سے بھرے ہوتے تھے۔میں اور عمیر بڑے شوق سے ان کو دیکھتے تھے۔پھل دار درخت پھل کے وزن سے جھکے ہوتے تھے اور ہرے بھرے درختوں پر نارنجی رنگ کینو بہت خوبصورت لگتے تھے۔

کچھ دیر کے بعد سرگودھا کا لاری اڈہ آگیا اور ہمیں یہاں سے ایک اور بس پکڑنا تھی۔یہ بس جس سڑک پر چل رہی تھی وہ ''کرانا'' پہاڑ کے درمیان بنائی گئی تھی۔ایک وقت میں اس کے دونوں اطراف پہاڑ ہوا کرتا تھا۔اب صرف اس سڑک کے مغرب کی طرف ہی ایک شاندار پہاڑ تھا۔اس پر کیکر کا گھنا جنگل تھا۔اور قریب ہی ائیر بیس بھی تھی۔اسکی چوٹی پر پاک فضائیہ کا راڈار بھی نصب تھا جو ہر وقت گھومتا رہتا تھا۔میں بڑے غور سے اسے دیکھا کرتا تھا۔غروبِ آفتاب کا وقت تھا اور ہلکی ہلکی دھند بیٹھنے لگی تھی جس سے راڈار کا صرف ایک ہیولا سا ہی نظر آرہا تھا۔لاری آگے بڑھتی جا رہی تھی۔اور راڈار پیچھے رہتا جا رہا تھا۔مگر میں نے آخر تک اسے دیکھا۔اور پھر سڑک کے دائیں طرف ایک بڑی چٹان آئی جو ختم ہوئی تو راڈار بھی میری نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔میں نے اپنا منہ اندر کرلیا۔ڈرائیور نے لاری کی رنگین بتیاں جلا دیں۔سورج ڈوب چکا تھا اور اب سرد ہوا کھڑکیوں سے اندر آنے لگی تھی۔امی نے مجھے ٹوپی پہنا دی اور کھڑکی بند کر دی۔مجھے اب باہر دیکھنے میں دلچسپی بھی نہ تھی۔کیونکہ 'کرانا' کا خوبصورت حصہ اب ختم ہو چکا تھا۔کیکر کے درخت اب بہت پیچھے رہ گئے تھے۔اب ایک دم یہ پہاڑ خشک پہاڑی بن گیا تھا۔مجھے اس کا یہ حصہ پسند نہیں تھا۔ یہاں دھواں اور مٹی ہوا کرتی تھی۔اور کبھی کبھی بارود پھٹنے کی آوازیں آیا کرتی تھیں۔پہاڑ کا یہ حصہ توڑ کر بجری میں تبدیل کیا جا رہا تھا اور یہ بجری ٹرکوں میں بھر کر وزیری پٹھان پورے ملک میں پہنچاتے تھے۔مجھے اچھا ہی لگتا تھا کہ خشک اور بنجر پہاڑ ہے ٹوٹنے دو۔آخر کئی لوگوں کا روزگار اس سے وابستہ ہے۔یہ علاقہ پار کر کے ہم چودھویں میل تک پہنچ گئے۔یہاں ہمارا گاؤں تھا۔ہمیں اتار کر لاری 'کرانا' کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ گئی۔ہم تانگے پر بیٹھے اور آگے کی

طرف روانہ ہو گئے ۔راستے میں ایک بہت چھوٹی پہاڑی آتی تھی ۔جس کی طرف بہت کم دھیان جاتا تھا۔البتہ چھوٹی ہونے کی وجہ سے اور کم ڈھلوان کی وجہ سے بچوں کو یہ پسند تھی ۔گاؤں کے بچے اکثر اس پر چڑھ کر پتھر پھینکنے کے مقابلے کیا کرتے تھے ۔'کرانا' کے سامنے تو یہ کچھ بھی نہ تھی مگر شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ ابھی اُگ رہی تھی ۔یہ بھی مجھے کسی نے بتایا تھا کہ پہاڑ اُگا کرتے ہیں ۔اور اسکے ثبوت کے طور پر اس نے مجھے ایک چھوٹی چٹان دکھائی تھی جو زمین سے گنے کے کٹے ہوئے تنے کی طرح باہر نکلی ہوئی تھی ۔خیر ہم گاؤں میں داخل ہوئے ۔شروع میں برگد کا درخت تھا۔اس سے آگے کی طرف گندم سے آٹا بنانے کی مشین تھی ۔آگے سے بائیں طرف مڑ کر چوک میں ہمارا گھر تھا۔جس کے آگے سُکھ چین کا درخت ہے۔

ہم گھر پہنچے تو سب سو چکے تھے ۔ہم نے ان کو جگانا مناسب نہ سمجھا اور سو گئے ۔صبح اٹھے اور ناشتہ وغیرہ کیا۔ اسکے کچھ ہی دیر بعد ابا جی سے ملنے والوں کا تانتا بندھ گیا ۔ان کے دوست، گاؤں کی عورتیں پورا گاؤں ہی ان سے بہت محبت کرتا تھا۔سارا دن عورتیں ہمارے گھر نازل رہتی تھیں اور میری امی اور دادی سے ادھر اُدھر کی باتیں کرتی رہتی تھیں ۔میرے دادا بہت تنگ پڑتے تھے ۔اور اکثر ان سے ناراضگی کا اظہار کرتے تھے ۔میری پھوپھیوں نے گھر میں ایک فری سکول کھول رکھا تھا۔آدھا دن تو وہاں سکول چلتا تھا۔میرے تایا بچوں کو مسجد میں قرآن کی تعلیم دینے جاتے تھے ۔گویا گاؤں کی جو پُرسکون زندگی ہمیں کتابوں میں دکھائی دیتی ہے میں نے اس گھر میں نہیں دیکھی ۔ہاں شام کو سب فارغ ہو جاتے تھے اور کھانا ایک ساتھ کھاتے تھے۔

عید سے ایک دن پہلے ہم نے اپنے چچا جان کو ہمارے ساتھ دووالی پہاڑی پر جانے کے لیے رضامند کیا۔ اسے دووالی اس لیے کہتے تھے کیونکہ وہ چھ چک کے ہمسائے دو چک میں تھی ۔اس کا رنگ بہت سیاہ تھا۔اور جسامت میں یہ 'کرانا' سے چھوٹی مگر گاؤں کے راستے والی پہاڑی سے کافی بڑی تھی ۔لوگ کہتے تھے اس کے نیچے فولاد بڑی مقدار میں ہے۔اور یہ بہت زیادہ مضبوط ہے ۔اس کی بجری بنانا ممکن نہیں ۔اس کی تیز چڑھائی اور کالا رنگ اسے ممتاز کرتا تھا۔'کرانا' تو صرف جسامت میں بڑا تھا۔یہ تو لوگوں کے دلوں میں بڑی تھی ۔کیونکہ لوگوں کے لیے یہ ایک عام جگہ تھی ۔جب کہ 'کرانا' تو کہیں فضائیہ کے کنٹرول میں اور کہیں بارود کی زد میں تھا۔خیر ہم اس کی چوٹی تک چڑھے اور

اوپر سے منظر دیکھا۔کھیت اور دوسری چیزیں چھوٹی چھوٹی لگ رہی تھیں۔دور سے آنے والی مشین کی ''ہک ہک ہک'' کی آواز آ رہی تھی۔ہم کچھ دیر وہاں بیٹھے اور واپس چل دیے۔

عید منا کر ہم واپس آ گئے۔یونہی ہر سال ہم جاتے اور چھٹیاں گذار کر آ جاتے تھے۔پھر ایک دن خبر آئی کہ میری ایک پھوپھی گذر گئی ہیں۔ہم گئے، وہاں سوگ کا عالم تھا۔تدفین کر کے آ گئے۔اس سال ہم نے عید نہ منائی۔ اگلے سال میری دادی گذر گئیں۔اب اس گھر میں میری چھوٹی پھوپھی، تایا اور دادا رہتے تھے۔گھر کی رونق کافی حد تک ماند پڑ چکی تھی۔میری چھوٹی پھوپھی ذرا سخت مزاج تھیں۔گاؤں کی عورتوں سے ان کا سلوک ہماری دادی جیسا نہ تھا۔ پھر ان کی بھی شادی ہو گئی۔اب دادا اور تایا اکیلے رہ گئے تھے۔دادا اکیلے اتنے بڑے صحن میں بیٹھے رہتے تھے اور تنہائی ان کو اندر سے کھاتی جا رہی تھی۔پھر میرے دادا بھی گذر گئے۔سب لوگ وہاں گئے لیکن میرے میٹرک کے امتحانات چل رہے تھے تو میں نہ جا سکا۔اب اس گھر میں صرف تایا رہا کرتے تھے۔پچھلے پانچ سالوں میں ہمارا خاندان اپنے تاریک ترین دور سے گذرا تھا۔وہ گھر جتنا پُر رونق تھا اُتنا ہی ویران ہو گیا۔میرے والد یہاں ہیپاٹائٹس کا شکار ہو گئے۔ اب میں گھر کا بڑا لڑکا تھا۔دونوں بھائیوں کی ذمہ داری مجھ پر آ گئی۔طبیعت میں سنجیدگی آ گئی تھی۔یوں کچھ سال گذر گئے اور بہت کچھ بدل گیا۔اب مجھے اُس گھر سے زیادہ اپنی فکر تھی اور میں اپنے مسائل میں گھر گیا تھا۔پھر ایک دفعہ کسی کام سے ہمیں گاؤں جانا پڑا۔

'کرانے' والی سڑک کچھ بدلی بدلی لگ رہی تھی۔جہاں راڈار کے آگے ایک چٹان آتی تھی اب وہاں ایک ہوٹل کھُل گیا تھا جس کے باہر گلابی اور ہرے رنگ کی ٹیوب لائٹیں جل رہی تھیں۔چٹان تو غائب تھی مگر کم از کم وہاں رونق آ گئی تھی۔'کرانے' کے دامن میں لوگ بسنے لگے تھے۔اِس کے علاوہ اس وقت کچھ نہ دیکھ سکا۔اگلے دن جب ہم واپسی کے لیے بڑی سڑک پر پہنچے تو دیکھا کہ 'کرانا' تو تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ساری سڑک کے ساتھ ساتھ ایسا ہی منظر تھا۔اس شاندار پہاڑ کا خاتمہ قریب تھا۔کہیں کہیں پتھریلی چٹانیں کھڑی تھیں، باقی سارا غائب تھا۔اس کی بجری بنا کر پورے ملک میں بھیج دی گئی تھی۔یہ پانچ سال 'کرانا' کے لیے قاتل ثابت ہوئے تھے۔پہاڑ کے ختم ہونے کے بعد خالی جگہ پر لوگ آ کر بس گئے تھے، لوگوں کا بھلا ہو رہا تھا مگر اب مجھے یہ بالکل پسند نہیں آ رہا تھا۔مجھے میرا پرانا 'کرانا'

پسند تھا۔ مضبوط، بلند و بالا پہاڑ جس کے سائے میں دوسری چھوٹی پہاڑیاں رہتی تھیں۔ اب وہ بات نہیں تھی۔ اب کرانا وہ کرانا نہیں تھا۔ پھر مجھے وہاں کی باقی دو پہاڑیوں کا خیال آیا۔ جن میں سے ایک فولاد سے بھری ہوئی تھی اور دوسری کافی چھوٹی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ ان دونوں کا انجام بھی 'کرانے' جیسا نہ ہو۔ میں نے دعا کی کہ ایسا نہ ہو مگر میرا دل جانتا تھا کہ ایک نہ ایک دن یہ ضرور ہو کر رہے گا۔

(علی امین لمز کے طالب علم ہیں)

ہم روحِ سفر ہیں ہمیں ناموں سے نہ پہچان
کل اور کسی نام سے آ جائیں گے ہم لوگ

رضی اختر شوق

راؤ فواد قمر

شہرِ خموشاں کے مکین

حسنات بیگ کی آج اس شہر میں پہلی صبح تھی۔کل شام ہی اس کے گھر والے اور عزیز رشتہ دار اسے یہاں چھوڑ کر گئے تھے۔خود حسنات بیگ کو بھی اس بات کا احساس کل ہی ہوا تھا کہ اس کے رشتے داروں کی تعداد اتنی زیادہ ہے، کیونکہ وہ کل پہلی مرتبہ ان سب کو ایک ساتھ دیکھ رہا تھا۔اس نئے شہر میں بھی بہت سے چہرے تھے جن میں سے کچھ تو مانوس لگتے تھے مگر زیادہ تر اجنبی تھے۔لیکن سب چہروں میں ایک بات مشترک تھی۔وہ پرسکون تھے کہ جیسے کسی لمبے سفر کے اختتام پر سکون کا سانس آ گیا ہو۔ان سب چہروں پر اطمینان تھا کہ جیسے اب وہ مزید تھکن، سفر، فکر کی قید سے آزاد ہوں۔

حسنات بیگ کو اس شہر میں رہتے کچھ عرصہ بیت چکا تھا۔لیکن وہ ایک پل کے لیے بھی اس شہر اور اس کے طور طریقوں سے مانوس نہ ہوا تھا۔اسے یہ سب مضحکہ خیز لگتا تھا کیونکہ وہ اس زندگی کا قطعاً عادی نہیں تھا جو وہ اس شہر میں گذار رہا تھا۔اس کا ماتھا ہر وقت شکن زدہ ہی رہتا تھا۔اس کا بس یہی دل چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا آئے اور اسے واپس لے جائے۔اس شہر کی زندگی بڑی عجیب تھی۔یہاں نہ تو کوئی صبح دفتر جاتا اور نہ ہی کوئی صبح سویرے اٹھ کر دنیا کی ٹھوکریں کھانے نکل پڑتا۔نہ کوئی کسی دوسرے کی چار دیواری پھیلنے کی کوشش کرتا اور نہ لالچ میں دوسرے کے خلاف پروپیگنڈا کرتا۔یہ لوگ دھن، دولت، زر، زمین، زن اور ہر طرح کی برائی سے پاک تھے۔نہ کسی کو ذات پات، رنگ اور نسل کی بنیاد پر دو گز جگہ زیادہ ملتی اور نہ ہی کم۔حسنات بیگ اس سب کو کیسے تسلیم کر لیتا۔وہ تو ٹھہرا ایک ملٹی نیشنل کمپنی کا اکاؤنٹس مینیجر، جس کی زندگی کا محور تو بس پیسہ، عزت، بنگلہ، گاڑی اور اسٹیٹس تھا کہ اسی کو ہی اس کے شہر کے لوگ بڑائی کا معیار

گردانتے تھے۔

حسنات بیگ تو ساری زندگی افراتفری کی زندگی گذارتا رہا تھا۔صبح اٹھنا، دفتر میں مشین کی طرح کام کرنا، شام کو لوٹنا اور تھکا ماندہ سو جانا، نہ کھانے کا ہوش اور نہ پینے کی فکر اور اگلے دن پھر سے وہی اٹھنا، کام کرنا اور سو جانا۔۔۔اور وہ یہ سب کیوں نہ کرتا۔اسے عزت بھی تو کمانی تھی اور عزت پیسے سے آتی ہے اور پیسہ کام سے۔اسے پتا ہی نہ چلا کہ ایسے کرتے کرتے کب اس کی زندگی کے پچیس سال گذر گئے اور اس کے بالوں میں سفیدی اتر آئی۔ لیکن اب اس چار دیواری میں اسے گھٹن محسوس ہوتی تھی جس کا رنگ بھی سرخ تھا جیسے لوہے کے پرزے کو صدیوں بھٹی میں پکایا گیا ہو۔

اپنے اس اکیلے پن سے گھبرا کر حسنات نے دوسرے لوگوں سے بات چیت شروع کی۔لوگوں نے بھی خیر مقدم کیا اور اس سے باتوں کے لیے وقت نکالا۔یہ احساس بھی حسنات کے لیے بالکل نیا تھا۔لوگوں سے بات کرنے پر پتا چلا کہ یہاں صرف وہی اکیلا نہیں ہے جسے مقدر یہاں لایا ہے بلکہ سب کے ساتھ یہی معاملہ ہے۔قدیر خاں کو اس کی جان سے پیاری کار کا حادثہ، اماں مجن کو ان کا سیڑھیوں سے پھسلنا، چودھری سلامت کو جائیداد اور زمین کا تنازعہ، کرم دین کو اس کے مالک کا بے قابو غصہ اور حسن کو عورت کی لت یہاں لائی تھی۔حسنات نے بھی سب کو بتایا کہ وہ دل کے مرض اور ڈپریشن کی وجہ سے یہاں آیا ہے۔اس نے یہ بھی بتایا کہ اسے یہ جگہ ہرگز پسند نہیں ہے۔یہ سن کر سب ہنسنے لگے۔

قدیر خاں بولا: ''میاں! ہم کو یہ جگہ قابل قبول نہ تھی مگر یقین جانو کہ یہ جگہ اُس جگہ سے، جس کے بھی تم باسی تھے، ہزار درجے بہتر ہے''۔

مگر حسنات بیگ یہ ماننے کو ہرگز تیار نہ تھا۔

ایک صبح سارا شہر خوشبو سے مہک رہا تھا کہ جیسے کسی نے بادصبا میں گلاب کی پتیوں کا رس ملا دیا ہو۔حسنات نے لوگوں سے معلوم کیا کہ کیا ماجرا ہے؟ اسے بتایا گیا کہ چودھری سلامت کے گھر والے ان سے ملنے آئے ہیں۔آج کے دن چودھری سلامت کو اس شہر میں آئے دس سال ہو گئے ہیں۔ہر سال اسی دن چودھری صاحب کے گھر والے آتے

ہیں، سارے شہر کو مہکاتے ہیں اور پھر سے گم ہو جاتے ہیں۔لیکن چودھری صاحب اسی بہانے اپنے پوتوں اور بیٹوں کو دیکھ کر خوش ہو جاتے ہیں۔

''لیکن بہت سوں کو تو یہ خوشی بھی نصیب نہیں ہوتی''، قدیر خاں نے سرد آہ بھری اور بات جاری رکھی۔''ہاں عید یا محرم پر کچھ لوگوں کے ملاقاتی آتے ہیں جو محرم میں تو کچھ دیر بیٹھ جاتے ہیں لیکن عید کے موقعے پر پانچ منٹ سے زیادہ وقت ضائع کرنا گوارا نہیں کرتے''۔

حسنات بیگ کو اپنا بیٹا یاد آ گیا۔''وہ بھی آج اس قابل ہو گیا ہو گا کہ بڑی گاڑی میں دفتر جاتا ہو گا''۔اس نے خود کلامی کی۔''لیکن کتنے دن ہو گئے اس نے ادھر کا رخ نہیں کیا''۔حسنات بیگ کے دل میں بیٹے سے ملنے کی شدید خواہش پیدا ہوئی۔''شاید مصروف ہو گا کام میں، ورنہ مجھے بھول تھوڑی سکتا ہے! وقت ملتے ہی ضرور آئے گا''۔حسنات بیگ نے خود کو تسلی دی۔

اس شہر کے لوگوں کا معمول تھا کہ صبح اور سہ پہر کے اوقات میں، جب لوگ دفاتر اور تعلیمی اداروں سے آ اور جا رہے ہوتے ہیں، شہر کی بیرونی دیوار سے اپنے پیاروں کو گذرتا دیکھتے تھے اور ان کی ایک نگاہ کو ترستے تھے لیکن وہ عجلت کے مارے کہاں دیکھنے والے تھے؟ جب کوئی نیا آدمی اس شہر میں آتا تو لوگ اس سے اپنے پیاروں کا حال احوال پوچھتے۔اگر وہ جانتا ہوتا تو خبر کرتا ورنہ لوگ کسی نئے مخبر کے انتظار میں لگ جاتے۔ایسے ہی ایک مخبر کے ذریعے حسنات بیگ کو خبر ہوئی کہ اس کا بیٹا بڑا آدمی بن گیا ہے اور اب اسی کی کرسی سنبھالتا ہے۔حسنات بیگ نے رسمی تبسم کیا مگر اس کے اندر آنے والے وقت کی سنگینی کو لے کر فکرمندی کے جذبات نے جنم لیا اور وہ اندر سے خوش نہ تھا۔

اس شام سب لوگ چودھری سلامت کے ہاں جمع تھے۔محفل جمی تھی اور چودھری صاحب ماضی کے قصے سنا رہے تھے۔

''ایک دفعہ کیا ہوا کہ فضل دین ہماری پنچائیت والی کرسی صاف کر رہا تھا۔انجانے میں وہ اس پر بیٹھ کر سامنے پڑی میز کو صاف کرنے لگا۔ہم نے جب یہ دیکھا تو تاؤ میں آ گئے اور مار مار کر فضل دین کو ادھ موا کر دیا۔وہ ہم سے معافی مانگنے لگا''۔یہ کہہ کر چودھری صاحب نے فضل دین کی طرف التجائیہ نظروں سے دیکھا جو ان ہی کے ساتھ شانہ

بشانہ ان کی چارپائی پر بیٹھا تھا۔اور فضل دین نے بھی نظروں کے اشاروں سے انھیں معاف کردیا اور مسکرادیا۔

حسنات بیگ کو اب اس شہر میں بہت عرصہ بیت چکا تھا۔اس شہر کی آبادی بتدریج بڑھتی جاتی تھی لیکن پھر بھی لوگ فساد کے بغیر رہتے تھے۔اس شہر میں سنی، شیعہ اور اہل حدیث سبھی رہتے تھے۔ایک دن حسنات بیگ کو پتا چلا کہ شہر میں دو لوگ نئے آئے ہیں اور وہی غم کرتے ہیں جو وہ کیا کرتا تھا۔حسنات ان سے ملنے گیا۔دیکھتے ہی پہچان گیا کہ یہ اس کے اعلیٰ افسر ہوا کرتے تھے اور مرتبے اور دولت میں حسنات بیگ سے کہیں اوپر تھے۔ملتے ہی انھوں نے اس نئے شہر کی بابت اپنا دکھڑا سنایا۔حسنات بیگ مسکرایا اور بولا ''ہم سب کو بھی یہ جگہ قابل قبول نہ تھی مگر یقین جانو کہ یہ جگہ اُس جگہ سے، جس کے بھی تم باسی تھے، ہزار درجے بہتر ہے''۔

حسنات بیگ کی ماتھے کی شکنیں غائب ہو چکی تھیں اور اس کی چاردیواری کا رنگ بھی میٹھے پرسکون نیلے رنگ میں بدل چکا تھا۔

(راؤ فواد قمر لمز کے طالب علم ہیں)

بارے دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

میر تقی میرؔ

محمد حمزہ نسیم

اسٹیٹس سمبل

میرا یہ روز کا معمول تھا۔ میں آفس سے گھر آنے کے بعد شام کی چائے اپنے شاندار بنگلے کی بالکونی میں پیتا تھا۔ شام کی چہل پہل مجھے بہت بھلی محسوس ہوتی تھی۔ یوں تو میرے والد صاحب کا اپنا ذاتی کاروبار تھا مگر میں ذرا مختلف مزاج رکھتا تھا، اِسی لیے کاروبار بڑے بھائی نے سنبھال لیا جب کہ میں نے ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں نوکری کرنے کو ترجیح دی۔ خوبصورت چہرے، مہذب لوگ، عمدہ لباس زیب تن کرنے والے اعلیٰ شخصیت کے حامل افراد ہمیشہ مجھے مرغوب رہے ہیں۔ اسی لیے ہمیشہ میری یہی کوشش رہتی ہے کہ ایسے لوگوں سے مراسم استوار کروں۔ فی زمانہ یہ بھی اسٹیٹس سمبل ہے۔ میرے حلقے میں جتنے بھی لوگ تھے وہ سب خوبصورت، خوش پوشاک اور پر کشش شخصیت کے حامل تھے۔ عام لوگوں کی طرف دیکھنے کی میں نے کبھی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔

بالکونی میں کھڑے ہو کر چائے پیتے میں اکثر سڑک پار اپنے سامنے والے نکڑ کے بنگلے کو پُرشوق نگاہوں سے دیکھتا۔ اِس بنگلے کا طرزِ تعمیر بہت ہی منفرد تھا۔ اِس بنگلے میں چند ہی ہفتے پہلے لوگ منتقل ہوئے تھے۔ میں آج بھی اِس بنگلے کی طرف دیکھ رہا تھا جب اِس کے گیٹ سے میں نے ایک خوبرو، اونچے، لمبے اور خوبصورت شخص کو نکلتے دیکھا۔ اُس نے کالے رنگ کا تھری پیس سوٹ پہن رکھا تھا۔ جس پر اُس کی گوری چمکتی رنگت اور بھی نکھری ہوئی اور دلکش لگ رہی تھی۔ وہ بنگلے سے نکل کر دائیں طرف چل پڑا۔ مجھے گمان تھا کہ شاید وہ اپنی گاڑی کا، بنگلے کی پارکنگ سے نکلنے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کا چلنے کا انداز اور رکھ رکھاؤ سب بہت پُرکشش تھا۔ مجھے وہ پہلی ہی نظر میں اچھا انسان لگا۔

میں اپنے معمول کے مطابق اگلے روز پھر چائے کا کپ ہاتھ میں لیے بالکونی میں کھڑا تھا جب وہ سامنے

والے بنگلے سے نکل کر پیدل چلنا شروع ہوگیا۔اس نے آج بھی سیاہ رنگ کا تھری پیس سوٹ پہن رکھا تھا۔یہ تھری پیس سوٹ اُس کی شخصیت کو چار چاند لگا رہا تھا۔وہ کل کی طرح آج بھی بنگلے کے وسیع گیٹ سے نکل کر پیدل ہی چلنے لگا اور کچھ دیر بعد میری نظروں سے اوجھل ہوگیا۔حیرت کی بات ہے کہ اتنے وسیع و عالی شان بنگلے میں رہنے کے باوجود اور اتنی گاڑیوں کے ہوتے ہوئے بھی یہ شخص پیدل سفر کیوں کرتا ہے؟ میں نے دل میں سوچا اور چائے ختم کر کے کمرے میں چلا گیا۔اگلی شام پھر وہ اپنے مخصوص وقت پر نکلا اور پیدل اپنے سفر پر نکل پڑا۔ مجھے جیسے ایک دلچسپ مشغلہ ہاتھ لگ گیا تھا۔میں اُسے دیکھتا اور وہ آگے پیچھے کی پروا کیے بغیر پیدل چلتا ہوا سڑک کے آخری سرے تک جاتا اور گم ہو جاتا۔میں اُس کے پیچھے بس سوچتا ہی رہ جاتا کہ اپنے بڑے بنگلے سے نکلتا ہے، اتنا قیمتی تھری پیس سوٹ پہن رکھا ہوتا ہے تو اپنی پارکنگ میں کھڑی گاڑیوں میں سفر کیوں نہیں کرتا؟ پیدل کیوں جاتا ہے؟ اور کہاں جاتا ہے؟ اور وہ بھی روزانہ اپنے مخصوص وقت پر۔یہ بھی اسٹیٹس سمبل کی کوئی قسم تھی یا کوئی تجربہ۔ہم جیسا اکثر امیر زادوں کو ایسے تجربے کرنے کی عادت ہوتی ہے۔اس کی دلکش شخصیت نے میری فطرت کو اُس سے دوستی کرنے پر اکسایا اور میں نے ٹھان لیا کہ اگلے دن میں اُس سے بات کروں گا۔

اگلے دن میں اپنے وقت سے کچھ دیر پہلے ہی چائے لے کر بالکونی میں آ گیا۔میں چائے کا آخری گھونٹ بھر رہا تھا کہ میری نظر اُس پر پڑی۔وہ گیٹ سے باہر نکل کر چوکیدار سے کچھ کہہ رہا تھا۔میں جلدی سے اپنے گھر کے بیرونی دروازے پر گیا۔وہ اب کچھ فاصلے پر مجھے پیدل جاتے ہوئے دکھائی دیا۔تھوڑی دیر میں ایک بس آئی اور وہ اُس بس میں بیٹھ گیا اور وہ بس میری نظروں سے اوجھل ہوگئی۔اس امیر زادے کی فطری سادگی نے میرے اندر کے فطری شخص کو ہوا دی۔میں اگلے دن اپنے مخصوص وقت سے کچھ پہلے ہی چائے پی کر فارغ ہوگیا اور اپنی گاڑی نکالنے لگا، جب مجھے اس کے بنگلے سے ایک شاندار گاڑی نکلتی ہوئی نظر آئی۔اُس کا ڈرائیور چلا رہا تھا اور وہ اُس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔عموماً مالک ڈرائیور کے ساتھ نہیں بیٹھتے مگر وہ تو مختلف تھا۔انسانی رویوں میں اخلاقیات کا ایک اعلیٰ ثبوت۔۔۔مجھے اُس کی شخصیت کے اِس پہلو نے مزید متاثر کیا۔میں نے اپنی گاڑی اُن کی گاڑی کے پیچھے چلانا شروع کر دی۔حیرت کی بات یہ ہے کہ گاڑی کل والی مین روڈ پر رکی اور ڈرائیور نے اُسے اتارا اور مختلف سمت میں گاڑی بھگاتا ہوا لے گیا،

اور وہ کچھ دیر بعد بس میں سوار ہو گیا۔ میں نے گاڑی بس کے پیچھے چلانا شروع کر دی۔ بس رکتی تو میں رکتا اور بس سے اترنے والوں کو غور سے دیکھتا۔ وہ ابھی تک نہیں اترا تھا اور بس میں ہی تھا۔ کچھ دیر بعد وہ بس سے اترا اور ایک سمت میں چل پڑا۔ وہ چلتا ہوا شہر کے سب سے بڑے فائیو سٹار ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ کیا وہ روز اتنے بڑے فائیو سٹار ہوٹل میں ڈنر کرتا ہے؟ ایک طرف اتنی امارت اور دوسری طرف اتنی عاجزی؟ اس کی شخصیت، اس کا اخلاق، غرض اُس کی ہر چیز سے متاثر ہو کر میں اُس سے دوستی کرنے کا خواہش مند ہو گیا۔ اگلے دن میں دل میں پکا اِرادہ کر کے بیٹھا تھا کہ اُس سے بات کروں گا۔ میں آج آفس سے جلدی گھر آ گیا۔ میں نے چائے منگوائی اور کپ لے کر بالکونی میں آ گیا۔ وہ بنگلے کے کشادہ لان میں میز کے گرد پڑی کرسیوں میں سے ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ اور اُس کے سامنے دو کرسیوں پر بچے کتاب لے کر بیٹھے تھے۔ میرے ذہن میں سوال ابھرا، کیا وہ شادی شدہ ہے اور کیا یہ اُس کے بچے ہیں، یا اُس کے چھوٹے بہن بھائی ہیں؟ دونوں صورتوں میں اُس کی ایک اور خوبی میرے سامنے نکل آئی تھی۔ یعنی وہ بچوں کی تعلیمی سرگرمیوں پر بھی نظر رکھتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے گھڑی پر وقت دیکھا اور کوٹ درست کرتا ہوا گھر سے نکلا اور پیدل چلنا شروع ہو گیا۔ میری چائے ختم ہو چکی تھی۔ گذرے کل کی طرح میں پھر اُس کے پیچھے چلنے لگا۔ آج بھی اُس نے بس میں سفر کیا اور پھر اُسی شاہراہ پر اُتر کر پیدل چلتا ہوا اُس فائیو سٹار ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ بس میں سفر کرنے کے باوجود اُس کے تھری پیس سوٹ کی چمک دمک اُسی طرح برقرار رہی جس سے اُس کی شخصیت کی نفاست کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔

میں خاموشی سے ہوٹل میں داخل ہوا اور ڈائننگ حال کی طرف چلا گیا۔ میرے بیٹھنے کے کچھ ہی دیر بعد ویٹر آرڈر لینے آ گیا۔ میں نے اپنے اطراف نظر دوڑائی مگر مجھے وہ شخص کہیں نظر نہیں آیا۔ ہو سکتا ہے وہ وی آئی پی لاؤنج میں ہو، میں نے دل میں سوچا مگر اُس شخص کا سا کوئی چہرہ مجھے دکھائی نہیں دیا۔ میں نے ویٹر کو آرڈر دیا اور اِدھر اُدھر نظریں گھما کر اُس کو تلاش کرنا شروع کر دیا مگر مجھے وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ وہ داخل تو اِسی ہوٹل میں ہوا تھا مگر نہ جانے اچانک کہاں غائب ہو گیا۔ میں اب بار بار پہلو بدل رہا تھا۔ کھانا میز پر لگ چکا تھا۔ میں نے بہت آرام سے کھانا کھایا کہ شاید وہ مجھے کہیں نظر آ جائے۔ ویٹر ٹیبل سمیٹ رہا تھا کہ آواز آئی۔

''السلام علیکم سر۔۔۔۔ہمارے ہوٹل میں کھانا کھانے کا شکریہ۔آپ معزز مہمانوں کی رائے ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتی ہے۔آپ کو ہمارے ہوٹل کا ماحول اور کھانا کیسا لگا؟''

بہت شائستہ لہجے میں میرے دائیں طرف کھڑے ہوئے شخص نے مجھ سے انگریزی میں پوچھا۔میں نے اُس کے چہرے کی طرف دیکھا۔اور پھر اُس کے تھری پیس سوٹ کی طرف دیکھا۔اُس کے سوٹ پر لگے ہوئے مینجمنٹ کے بیج کو دیکھا اور مجھے اُس کو پہچاننے میں اور بنگلے میں اُس کی موجودگی کو جاننے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگا۔میں نے اُس کے سوال کے جواب میں اپنی رائے کا اظہار کیا اور ٹیبل پر بل اور ٹپ رکھ کر تیز قدم بڑھاتا ہوا ہوٹل سے باہر نکل گیا۔

(محمد حمزہ نسیم لمز کے طالب علم ہیں)

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

غالبؔ

ذیشان دانش

بے بسی اور بے حسی

مجھے اب بھی اچھی طرح یاد ہے جب میری عمر کوئی سات آٹھ برس تھی، میرے والد صاحب مرحوم، اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے درجات بلند فرمائے، مولویوں کے مزاج کی تندی و سختی دیکھ کر کہا کرتے تھے کہ یہ کہاں کا اسلام اور کہاں کی نمازیں ہیں کہ کوئی شخص مسجد کے دروازے پر مر رہا ہوتا ہے اور لوگوں کو اپنی جماعت کی نماز کی فکر ہوتی ہے۔ خواہ وہ بیچارہ آدمی مرتا ہو تو مرے۔

گذشتہ روز ایسا ہی ایک واقعہ بی او آر کی جامع مسجد انوارِ مصطفیٰ کے باہر پیش آیا۔ یہ مسجد مین روڈ پر واقع ہے۔ عصر کی نماز کے وقت ایک عورت باہر کی طرف مسجد کی دیوار کے ساتھ بے سُدھ پڑی تھی۔ بال پراگندہ اور کپڑے میلے تھے۔ زندگی کے آثار دکھائی نہ پڑتے تھے۔ میں نے جب یہ منظر دیکھا تو مسجد کے گیٹ پر کھڑے گارڈ سے پوچھا کہ زندہ ہے یا بے ہوش؟ اس نے کہا کہ بے ہوش لگتی ہے، کوئی رکشے والا اُٹھا کر یہاں ڈال گیا ہے۔ اسی لمحے مجھے اپنے والدِ مرحوم کی وہ بات یاد آ گئی اور میں نے دل میں ٹھان لی کہ میں اس کی ضرور مدد کروں گا۔ لوگ جوق در جوق نماز کے لیے آتے رہے اور اس عورت کو دیکھ کر رکتے اور پھر اندر جماعت کی نماز کے لیے لپکتے رہے۔ میں نے مسجد کے اندر جھانکا تو جماعت کھڑی ہو چکی تھی، میں بھی مسجد میں داخل ہو گیا اور نیت باندھ لی۔ میں نے سوچا کہ مجھ میں اور باقی لوگوں میں کیا فرق ہے؟ لیکن میں نے یہ سوچ کر اپنے دل کو تسلی دی کہ میں نماز کے بعد ضرور اس کی مدد کروں گا اور ہو سکتا ہے اس دوران کوئی خدا ترس آدمی اس کی مدد کر دے اور اسے ہسپتال پہنچا دے۔

نماز کے بعد باہر آ کر دیکھا تو کچھ لوگ اس کے اردگرد کھڑے تھے۔ میں نے ایک رکشے والے سے بات

کی، جوابھی نماز پڑھ کر ہی نکلا تھا۔ بھائی اس خاتون کو جناح ہسپتال پہنچا دو، یہاں سے بمشکل ایک کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ کتنے پیسے لو گے؟ اس رکشہ والے نے کہا کہ بھائی صاحب میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ وہ لوگ مجھ سے پوچھ گچھ شروع کر دیں گے۔ مجھے آپ اس مصیبت میں نہ ڈالیں۔ میں اسے نہیں لے جا سکتا۔

رکشے والے سے مایوس ہو کر میں نے ریسکیو 1122 پر فون کیا کہ بی او آر کی مسجد کے سامنے ایک عورت بے ہوشی کی حالت میں ہے، لہٰذا ایمبولینس بھیج دیں۔ جواب آیا کہ ایمبولینس نہیں ہے۔ کہاں گئیں؟ ترکی کے صدر صاحب کے پروٹوکول کے لیے گئی ہیں اور کچھ لاہور میں ایکسیڈینٹ وغیرہ کے کیس میں گئی ہیں۔ پھر ہم کیا کریں؟ آپ 115 پر رابطہ کریں۔ یہاں فون کیا تو انھوں نے پوچھا کہ عورت بالغ ہے یا نابالغ؟ وارث ہے یا لاوارث؟ جب میں نے بتایا کہ لاوارث لگتی ہے تو اس نے کہا کہ 15 پر پولیس سے رابطہ کریں۔

اس دوران وہاں پر موجود لوگ اپنی اپنی چہ مگوئیوں میں مصروف تھے۔ کوئی اس عورت کے چہرے پر سے مکھیاں اڑا رہا تھا۔ کوئی اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے پھینک رہا تھا۔ ایک آدمی اپنے گھر سے دودھ کا گلاس لے آیا۔ ایک آدمی نے بتایا کہ آج تو ڈاکٹروں نے ہڑتال کی ہوئی ہے اور جناح ہسپتال سارے کا سارا بند ہے۔ کیا ایمرجینسی بھی بند ہے۔۔۔؟ آہو۔۔۔ کوئی حکومت کو برا بھلا کہہ رہا تھا۔۔۔ اور کوئی کسی کو۔۔۔

15 پر فون کیا تو کسی نے بڑی مستعدی سے فون اٹھایا اور ساری صورتِ حال پوچھ کر فوراً فون بند کر دیا جیسے ان کی ٹیم فون بند کرتے ہی روانہ ہو گئی ہے۔ میں وہاں پر کھڑے ہو کر 15 کی مدد کا انتظار کرنے لگا۔ میری آنکھیں سڑک پر ان کے انتظار میں تھک گئیں۔ لیکن کوئی نہ آیا۔ جناح ہسپتال بھی بند تھا۔ ایک رکشے والے کو روکا اور شیخ زید ہسپتال جانے کے لیے کہا۔ ''شیخ زید ہسپتال کے تو راستے بند ہیں''۔ اس نے کہا۔

''اچھا تو پھر سروسز یا جنرل ہسپتال لے چلو''۔

وہ ڈیڑھ سو روپے میں تیار ہو گیا۔ اس دوران میں نے وہاں پر موجود لوگوں سے کہا کہ رکشے کا کرایہ میں دے دوں گا، کوئی اس کے ساتھ چلا جائے۔ ہر کوئی ایک دوسرے کو دیکھنے لگ گیا۔ رکشے والے نے جب یہ معاملہ دیکھا تو وہ بھی وہاں سے دھیرے دھیرے کھسک گیا۔ ابھی تک 15 کی مدد نہیں پہنچی تھی۔ ایک صاحب نے 1122 پر فون کیا تو

انھوں نے کہا کہ 15 والے ہمیں کہیں گے تو ہم ایمبولینس بھیجیں گے۔

''ہماری ایسی نمازوں کا کیا فائدہ کہ ایک انسان مسجد کے باہر مر جائے اور ہم کچھ نہ کریں''۔ وہاں پر کھڑا ایک آدمی بولا۔

اسی طرح آدھا گھنٹہ گذر گیا۔ کچھ بھی نتیجہ نہ نکلا۔ بالآخر میں وہاں سے چلا آیا۔ راستے میں پھر سے انسانیت کی مدد کا جذبہ بیدار ہوا۔ ایک انسان کی جان بچانا گویا پوری انسانیت کی جان بچانے کے مترادف ہے۔ یہ سوچ کر میں وہیں سے واپس لوٹ آیا لیکن وہاں پر ابھی تک کوئی پیش رفت نہ ہوئی تھی۔ اسی طرح ہر کوئی بے یارومددگار کھڑا تھا۔ تھوڑی دیر کھڑے ہو کر میں نے اس کے لیے دعا کی اور واپس چلا آیا۔ لیکن میرے دل میں اس کی مدد نہ کرنے کا قلق اور افسوس اب تک باقی ہے اور اسی قلق اور افسوس کو ختم کرنے اور اپنی بے بسی ۔۔۔ اور ۔۔۔ اپنے حکمرانوں کی بے حسی پر ماتم کرنے کے لیے میں یہ تحریر لکھنے بیٹھ گیا۔

(ذیشان دانش لمز میں ریسرچ ایسوسی ایٹ ہیں)

تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

اقبال

محمد سلمان خالد

ہمسفر

مانو کے منہ پر خون دیکھتے ہی میں سمجھ گئی تھی کہ وہ اپنی فطرت سے باز نہیں آیا۔ وہ معصوم چوزوں کو اپنے پیٹ کا دوزخ بجھانے کی خاطر مار چکا تھا۔ مجھے اچانک ہی اس سے گھن محسوس ہونے لگی اور میں نے اسے غصے میں جھڑک دیا۔ وہ منہ بسورتا ہوا باہر بھاگ گیا۔ اس کے جانے کے بعد مجھے بہت افسوس ہوا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مجھے نجانے کیوں اپنی تربیت پر بڑا مان تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ میں مانو کو جانوروں سے دور، انسانوں میں رکھ کر اسے اس کی حیوانیت سے دور کر لوں گی مگر ایسا نہ ہو سکا۔ اماں اور بھیا نے تو مجھے اسی دن خطرے سے آگاہ کر دیا تھا جس دن چوزے اس گھر میں آئے تھے مگر مجھے یہ بات سمجھنے میں بہت دیر ہو گئی کہ اگر انسان اپنی حیوانیت پر قابو نہیں پا سکا تو مانو تو پھر جانور تھا۔

.....

آج سے تقریباً دس سال پہلے جب میں نے جوانی کی خوبصورت دنیا کی دہلیز پر قدم رکھا تو بہت سی منچلی امنگوں نے میرے دل میں سر اٹھانا شروع کر دیا۔ انھی میں سے ایک چاہنے اور چاہے جانے کی خواہش بھی تھی۔ اس خواہش کی تکمیل اس صورت میں ہوئی کہ میں اپنے ماموں زاد کو دل و جان سے چاہنے لگی۔ وہ بھی میری چاہت کے شعلوں سے بچ نہ پایا اور مجھ سے محبت کے قول و قرار کر بیٹھا۔ ہماری اس خوبصورت دنیا میں بھونچال تب آیا جب اس نے میرے والدین سے میرا ہاتھ مانگا۔ اماں نے اس رشتے کی مخالفت کی۔ اس نے میرے والدین کے پیروں میں گر کر منتیں کیں مگر اماں اپنی ضد سے باز نہ آئیں اور اسے بے عزت کر کے گھر سے نکال دیا۔ میں نے اپنے والدین کو پیار

پر ترجیح دی۔ مجھے اماں کے انکار کی کوئی وجہ سمجھ میں نہ آئی کیونکہ اس دن سے پہلے تک تو اماں بھی اس کو بہت چاہتی تھیں ۔میں نے اسے بھلانے کا فیصلہ کرلیا ۔بے شک یہ مشکل تھا مگر میں نے اپنے اس فیصلے کو دل وجان سے نبھایا۔

اس واقعے نے میری زندگی کو مکمل طور پر بدل دیا۔گھر میں تمام لوگ غیر محسوس طریقے سے میرا بہت زیادہ خیال رکھنے لگے اور وقتاً فوقتاً مجھے بھی اس بات کی تاکید کرنے لگے۔پہلے مجھے اس بات کا احساس نہ ہوا مگر جب کچھ عرصے کے بعد میں نے اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا تو مجھے یقین نہ آیا کہ یہ میں ہوں۔وہ میں نہیں کوئی اور تھی۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے ،بکھرے بال، چہرے پر ایسی زردی جیسے کوئی برسوں کا بیمار ہو۔میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ میں بہت بدل چکی ہوں۔وہ لڑکی جو پورے گھر میں چہکتی پھرتی تھی اپنا زیادہ وقت تنہا کمرے میں گذارنے لگی۔ بولتی تو میں پہلے بھی بہت کم تھی مگر اب یوں لگا کہ میں نے کبھی بات نہیں کی اور اگر اب بولی تو اپنی آواز بھی نہیں پہچان پاؤں گی۔

ایک دن ابا جان خلاف معمول دفتر سے آتے ہی میرے کمرے میں آگئے ۔ان کے ہاتھ میں ایک ڈبہ تھا جس میں جگہ جگہ بڑے بڑے سوراخ تھے۔وہ میرے پاس بیٹھ کر میرا حال چال پوچھنے لگے پھر انھوں نے مجھے کہا کہ میں اس ڈبے کو کھولوں ۔میں نے ڈبہ کھولا تو اس کے اندر موجود اس ننھے سے، معصوم سے، بھورے اور گھنے بالوں والے اور چمکتی آنکھوں والے بلی کے بچے پر مجھے بہت پیار آیا۔میں نے ایک دم ہی اسے گود میں لے کر پیار کرنا شروع کردیا۔ابا جان مسکراتے ہوئے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر باہر چلے گئے۔

وقت کے ساتھ ساتھ میں اور مانو ایک دوسرے کے قریب سے قریب تر ہوتے چلے گئے، اتنا کہ ایک دوسرے کی ضرورت بن گئے ۔مجھے اس کے بنا ایک پل چین نہ آتا تھا۔ہم ہمیشہ ساتھ رہتے۔میں اس کے کھانے پینے اور صفائی کا خیال رکھتی، وہ میرے بستر پر سوتا ۔اس کے قرب سے میں کچھ اس طرح بدلی کہ میری ہنسی بھی واپس آگئی اور میں دوبارہ پورے گھر میں چہکتی پھرتی ۔

.....

آج صبح میری آنکھ کھلی تو پورے گھر میں معمول سے زیادہ چہل پہل تھی ۔اماں مختلف قسم کے کھانے بنانے

میں لگی تھیں جب کہ ابا جان خلاف معمول کام کرنے والی ماسی کو ہدایات دے رہے تھے۔ میں امی کے پاس پہنچی۔ اس سے پہلے کہ میں پوچھتی، بھیا نے کچن میں داخل ہوتے ہوئے اعلان کیا کہ اماں جان مہمان آ گئے۔ اماں مجھے تیار ہونے کی ہدایت کر کے باہر چلی گئیں۔ میں تیار ہو کر مانو کو گود میں لیے امی کے کمرے میں پہنچی تو معلوم ہوا کہ ہماری دور کی رشتہ دار خاتون بہت سے تحائف کے ساتھ آئی ہیں۔ سلام دعا کے بعد باہر نکلی تو دیکھا کہ بھیا ہاتھ میں ایک پنجرہ لیے کھڑے ہیں جس میں چار ننھے منھے چوزے ہیں۔ مانو ان چوزوں کو دیکھتے ہی مچلا مگر میں نے فوراً اسے جھڑک دیا۔ بھیا کو اب یہ مسئلہ درپیش تھا کہ وہ ان چوزوں کو مانو کی موجودگی میں گھر میں کیسے رکھیں مگر میں بضد رہی اور بھیا کو انھیں گھر میں رکھنا ہی پڑا۔

.....

میں اماں کو گلے لگ کر بہت روئی، اس کے بعد ابا جان اور پھر بھیا کو۔ میرے لیے سب کو چھوڑ کر ایک بالکل نئی دنیا میں ان سے بہت دور جانا بہت کٹھن تھا مگر یہ خوشی تھی کہ میرا مانو میرے ساتھ ہی میری نئی دنیا میں جا رہا ہے۔ انتظار کرتے بہت وقت بیت گیا۔ گھڑی دیکھی تو رات کے تین بج رہے تھے۔ مانو میرے بستر کے ساتھ، نیچے سو رہا تھا۔ میرے شوہر اسی چوزوں والی خالہ کے بیٹے تھے اور وہ اس دن ہمارے گھر اسی سلسلے میں آئی تھیں۔ وہ کمرے میں داخل ہوئے اور میری ساری توجہ ان کی جانب مبذول ہو گئی۔

.....

میری نئی زندگی ہر طرح سے مکمل اور خوبصورت تھی مگر ایک مشکل تھی اور وہ تھا مانو۔ وہ شاید میری اس نئی زندگی کو قبول نہیں کر رہا تھا۔ وہ بہت چپ چپ رہنے لگا تھا اور نجانے کیوں جب بھی میرے شوہر میرے قریب آنے کی کوشش کرتے وہ ان پر حملہ کر دیتا، انھیں کاٹنے کی اور ناخن مارنے کی کوشش کرتا۔ میرے شوہر مانو سے تنگ آ چکے تھے اور روز مجھے سمجھاتے کہ اس بلے سے چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ میں ہمیشہ یہ کہہ کر ٹال دیتی کہ میں اپنے مانو کی وجہ سے ہی تو تندرست ہوں۔ اس کے بغیر میں پھر سے بیمار اور خاموش رہنے لگوں گی۔ وہ ہمیشہ کہتے کہ یہ میرا وہم ہے، ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ مانو ایک مسئلہ بنتا جا رہا تھا اور میری گھریلو زندگی کے لیے خطرہ۔ آخر ایک دن انھوں نے مجھے اس بات

کے لیے منا ہی لیا کہ وہ مانو کو دور کہیں چھوڑ آئیں گے۔ پھر انھوں نے مانو کو ایک بوری میں ڈالا اور اسے کہیں دور چھوڑ آئے۔ اس رات میں بہت سکون سے سوئی۔ مجھے نجانے کیوں مانو کے جدا ہونے کا کوئی دکھ تو نہیں تھا مگر ایک عجیب سا ڈر تھا کہ کہیں میں پھر سے بیمار نہ ہو جاؤں۔

کچھ دن بہت سکون سے گذرے مگر ایک دن مانو واپس پہنچ گیا، نجانے کہاں سے اور کس طرح وہ واپس آ گیا۔ میں بہت حیران ہوئی کہ مجھے اس کے آنے کی خوشی نہیں ہوئی بلکہ میں پریشان ہو گئی۔ میرے شوہر بھی اسے دیکھ کر بہت پریشان ہوئے۔ میں نے انھیں مانو سے چھٹکارا حاصل کرنے کا ایک انوکھا مشورہ دیا۔ اگلے دن صبح فجر کے وقت جب مانو گہری نیند کی آغوش میں تھا، میں نے اسے اپنے نرم ہاتھوں سے بہت پیار سے پکڑا اور ایک ڈبے میں ڈال کر اپنے شوہر کے حوالے کیا۔ وہ اسے لے کر ریلوے اسٹیشن پہنچے اور کراچی جانے والی ٹرین کے ایک ڈبے میں رکھ دیا۔ وہ ٹرین کے نکل جانے تک اسٹیشن پر موجود رہے تا کہ اس کا یقین کر لیں کہ مانو جا چکا ہے۔

اس دن کے بعد میں نے اپنے مانو کو کبھی نہیں دیکھا۔ مجھے کبھی کبھار اس کی یاد آتی ہے کیونکہ وہ ایک طویل عرصے تک میرا ہمسفر رہا ہے اور میرے دکھ سکھ میں شریک رہا ہے۔ مجھے اس کے جانے کا کوئی دکھ نہیں ہے۔ میں کچھ عرصہ ڈرتی رہی کہ دوبارہ بیمار اور خاموش نہ ہو جاؤں لیکن ایسا نہ ہوا۔ میرا ہمسفر آج بھی میرے ساتھ ہے پہلے کسی اور روپ میں تھا اور اب کسی اور روپ میں ہے۔

(محمد سلمان خالد لمز کے طالب علم ہیں)

شرط سلیقہ ہے ہر اک امر میں
عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیے

میر تقی میرؔ

حافظ فخر حیات

تلاش

نمازیوں کے جانے کے بعد میں بھی مسجد سے نکل پڑا۔شاید مجھے کسی کی تلاش تھی جو کھینچ لائی تھی ۔مگر وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی مجھے نہ مل سکا۔اس کی تلاش میں مَیں بہت سی جگہوں پر با قاعدگی سے جاتا تھا۔۔۔ان میں ایک جگہ مسجد بھی تھی۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے اپنے بڑوں سے یہی سُن رکھا تھا کہ وہ تمھیں مسجد میں ہی ملے گا۔بس جانا با قاعدگی سے اور کوئی ناغہ نہ ہونے دینا۔اسی خیال کو لیے میں نے با قاعدگی بھی اختیار کی مگر بعد میں چھوڑ دی۔

کسی نے مجھے بتایا کہ وہ تمھیں شاید مندر میں مل جائے ۔وہاں کیوں نہیں دیکھ لیتے۔پتا نہیں کیوں مندروں سے مجھے شروع سے بے تعلقی سی رہی تھی ۔شاید اس کی وجہ میری وہ بچپن والی کتاب تھی جو مجھے میرے ''استاذ'' نے دی تھی۔

کہانیاں تھیں یا نصیحتوں یا بغاوتوں کی داستانیں؟ پتا نہیں ۔البتہ دلچسپ ضرور تھیں۔کتابوں کے بارے میں یہی کہوں گا کہ ان کے چناؤ میں بہت احتیاط برتنی چاہیے۔یہ انسان کی بہترین دوست بھی بن سکتی ہیں اور بدترین دشمن بھی۔شاید کہانیوں والی کتاب ہی نے مجھے اس کی تلاش پر مجبور کیا تھا۔

مجھے یہ سن کر بہت حیرت ہوئی کہ جب میں ایسے لوگوں سے، جو اس کے سچے عاشق ہونے کا دعویٰ کرتے تھے اس کے متعلق پوچھتا تو انہیں بھی 'اس' کے ٹھکانے کا علم نہ ہوتا۔

اس کے وَصل کی خواہش نے مجھے مندر جانے پر بھی مجبور کر دیا اور میں وہاں بھی با قاعدگی سے جانے لگا۔

عجیب لوگ، عجیب رنگ، عجیب ۔۔۔۔، ہاں! مگر مقاصد سب کے ایک جیسے، کچھ اور مل جائے یا کھویا ہوا واپس آ جائے بس۔

ہاں میں یہ تو بتانا ہی بھول گیا کہ میں اسے تلاش کیوں کر رہا تھا۔ درحقیقت مجھے اس سے ''بستی'' کے مسائل پر بات کرنا تھی اور ان مسائل سے اسے آگاہ کرنا تھا۔ لیکن شاید وہ مجھ سے زیادہ ان مسائل کو جانتا ہوگا آخر 'بستی' پر اس کی حکومت جو چلتی ہے۔ میرے لیے پریشانی کی بات یہ تھی کہ وہ مجھے کبھی بستی میں بھی نظر نہیں آیا تھا۔

اب میرا مندر آنا جانا شروع ہو چکا تھا اور مندر کے لوگوں سے بھی جان پہچان ہو گئی تھی۔ مجھے مندر باقاعدگی سے آتے جاتے دیکھ کر مندر کے پنڈت صاحب ایک دن مجھ سے کہنے لگے کہ اتنی باقاعدگی تو یہاں کوئی نہیں کرتا۔ کیا بات ہے؟ میں نے ان سے اپنا مدعا بیان کیا تو انھوں نے مجھے ساتھ والے جنگل میں جا کر تلاش کرنے کو کہا اور یہ بھی بتایا کہ اُسی کی تلاش میں اس بستی کا کوئی نوجوان صدیوں پہلے جنگلوں میں نکل پڑا تھا اور سُنا ہے اس کو وہ مل بھی گیا تھا۔

میں نے اسی وقت ارادہ کر لیا اور جنگل کو نکل پڑا۔ چلتے چلتے میری ملاقات بہت سے لوگوں سے ہوئی۔ کچھ مجھے مندر کی وجہ سے پہچانتے تھے اور کچھ کو میں مسجد کی وجہ سے جانتا تھا۔ تھوڑا فاصلہ طے کر لینے کے بعد مجھے شور سا سنائی دیا۔ میں ڈر گیا مگر پھر ہمت کر کے آگے بڑھا اور دور سے دیکھنے لگا۔ مگر معلوم نہ ہو سکا کہ کیا ماجرا ہے۔

بہت تلاش کیا مگر وہ مجھے نہ مل سکا۔ کچھ جانور بھی مجھے اسی کی تلاش میں مصروف لگے کہ جیسے وہ اُسے اپنی ہی آوازوں میں پکار رہے ہوں۔ میں نے بھی سوچا کہ اس کو آواز دیتا ہوں۔ لیکن میں مشکل میں پڑ گیا کہ کس نام سے پکاروں۔ اسی کشمکش میں ادھر اُدھر پھرتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے آرام کرنے کے لیے ایک درخت کے ساتھ کمر ٹیک لی۔

اتنے میں ایک بزرگ نظر آئے۔ سبز رنگ لباس، نورانی چہرہ، لمبی زلفیں۔ میں نے لپک کر سلام کیا اور انھوں نے بڑی اپنائیت سے جواب دیا۔ میں نے ان سے اپنا مدعا بیان کیا کہ 'اس' کی تلاش میں آنکلا ہوں۔ ان بزرگ نے مجھے بتلایا کہ وہ اِدھر بھی نہیں ملے گا۔ اگر تو نے اسے ڈھونڈنا ہی ہے تو جا واپس اپنی بستی میں ''اسے اپنے آپ میں تلاش کر''۔

میں بہت مایوس تھا کہ یہاں بھی وہ نہ مل سکا مگر اطمینان بھی ہوا کہ اس کا ایک اور ٹھکانہ مل گیا ہے۔ کیا خبر وہ یہاں مل ہی جائے۔ مگر جب میں گھر پہنچا تو میں پریشان ہو گیا کہ اسے خود میں کیسے تلاش کروں۔

پھر یوں ہوا کہ میں نے اس کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا اور سوچتا ہی چلا گیا اور ایسا ہوا کہ کچھ ہی عرصے بعد میرا دِل 'اس' کی آواز میں بولنے لگا۔

(حافظ فخر حیات لمز کے طالب علم ہیں)

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھیرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں

حالؔی

ردا رشید

حوا کی بیٹی

آج بھی جب میں وہاں سے واپس جا رہا تھا تو میرا دل جانے کیوں بہت بوجھل سا ہو رہا تھا۔ ایسا نشہ مجھ پر طاری تھا کہ وہاں سے نکلنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ پہلے تو میں وہاں جانے کا قائل نہیں تھا لیکن پھر کچھ ایسا ہوا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی قدم اُس طرف کو اُٹھتے اور جب میں اُس مقام پر خود کو پاتا تو اپنے آپ سے سوال کرتا کہ میں یہاں کیونکر آ گیا ہوں؟

''تو خود اپنی مرضی سے آیا ہے''۔ میرے اندر سے کوئی آواز آتی۔ مجھے اب تک وہ دن یاد ہے جب میں اپنے دوست کے ہمراہ اس جگہ پہلی دفعہ آیا تھا۔ آج میں سوچتا ہوں کہ کاش میں اس کے ہمراہ یہاں نہ آیا ہوتا تو شاید میری یہ حالت نہ ہوتی۔ اب میں کوچے سے نکل کر سڑک پر پہنچ چکا تھا اور ہر طرف ویرانی سی چھائی ہوئی تھی۔ لوگوں کی جو بھیڑ ہوتی تھی، وہ اس وقت بالکل نہ تھی میں اپنے خیالوں کی دنیا میں گم چلتا جا رہا تھا۔

اب جب میں رات کو اپنے بستر پر بیٹھا اور اپنے پورے دن کے حالات و واقعات پر غور کرنے لگا تو اُس جگہ کے بارے میں، اُس منظر کو سوچتے ہوئے مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا کہ جیسے میں نیند کی آغوش میں ہوں۔ نہ جانے کچھ عجیب بے خودی سی مجھ پر طاری ہو گئی تھی۔

نیند سے بیدار ہوا تو میں نے خود کو ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ میرا دماغ پُرسکون تھا۔ مجھے اپنے کام پر جانے کی جلدی تھی۔ کام پر پہنچ کر بھی میں اپنے کام پر دھیان نہیں دے پا رہا تھا۔ میرے سامنے بار بار وہ خوبصورت چہرہ، کالی آنکھیں اور گلابی ہونٹ آتے تھے۔ میں نے سوچا آج جب میں وہاں جاؤں گا تو اُس سے بات کیے بغیر ہرگز واپس

نہیں آؤں گا۔پھر اچانک خیال آیا کہ یہ کیسا نشہ ہے جو اترنے کا نام ہی نہیں لیتا۔جب میں نے اس طرف کا رُخ کیا تو راستے میں میری ملاقات ایک دوست سے ہوئی۔

''بھائی کدھر جانے کے ارادے ہیں''؟میرے دوست نے مخاطب ہو کر کہا۔

''وہیں جہاں تم لے کر گئے تھے''، میں نے جواباً کہا۔

''مجھے پتا تھا تم وہاں جانے کے بعد سب پریشانیوں کو بھلا دو گے''۔میرے دوست نے کہا۔

خیالوں میں گم میں وہاں پہنچا تو کافی لوگ وہاں موجود تھے۔وہاں ہر طرح کے لوگ آتے تھے۔پھر گھنگھرو کی جھنکار اور پیروں کی دھمک کی آواز آئی اور رقاصہ محفل کی شان بڑھانے کے لیے آموجود ہوئی۔حسن و جمال کا ایک پیکر، چہرہ لال بھبھوکا، آنکھیں مے کی پیالیاں، گھنگھرو کی جھنکار اور پیروں کی تھرک سے فضا رنگین ہوگئی۔رقص کا انداز ایسا نرالا تھا کہ داد دیے بغیر رہا نہیں جا سکتا تھا۔نظریں نظروں سے ملیں تو میں ان میں کھو سا گیا۔رقص کے اختتام پر تمام لوگ اٹھ کر چلے گئے اور میں تنہا وہاں رہ گیا۔وہاں رقاصہ کے ساتھ اسکی سرکار بھی تھی۔

''کیا میں رقاصہ سے اکیلے میں بات کر سکتا ہوں''؟ میں نے گھبراتے ہوئے رقاصہ کی سرکار سے یہ الفاظ کہے۔جیسے یہ الفاظ بے اختیار میرے منہ سے نکلے ہوں۔

''کیوں نہیں''۔انھوں نے جواب دیا۔

لیکن رقاصہ کے چہرے پر کوئی عجیب سی کیفیت تھی جیسے وہ مجھ سے بات کرنے پر رضامند نہ ہو۔

اب میں ڈائری لکھنے بیٹھا ہوں تو مجھے ایسا لگا جیسے میں نے کچھ غلط کر دیا ہو۔مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔انھی خیالات میں گم بیٹھا رہا اور معلوم نہیں کب رات گذر گئی۔کام کی طرف روانہ ہوا۔آج میں نے شام کی محفل سے پہلے ہی وہاں جانے کا سوچا۔تنگ گلی سے ہوتا ہوا جب میں وہاں پہنچا تو سیڑھیوں سے ہوتا ہوا اوپر آ گیا۔اندر گیا تو رقاصہ کی سرکار نے لگاوٹ سے بیٹھنے کو کہا۔میں رقاصہ کا انتظار کرنے لگا۔

انتظار کرتے کرتے مجھے اچانک کمرے سے آواز آئی، ''میں بھی انسان ہوں۔میری بھی زندگی ہے آخر۔یہ سب میرے ساتھ ہی کیوں''؟

یہ الفاظ سن کر حیرت ہوئی اور یہ آواز مجھے رقاصہ کی معلوم ہوئی ۔شاید یہ اسی کی آواز تھی، میں نے خود سے سوچا۔

اسی لمحے رقاصہ کمرے میں داخل ہوئی ۔میں اُس کے جمال میں گم سا ہو گیا اور میرے ذہن میں وہ الفاظ چکرانے لگے جو میں نے ابھی سنے تھے، میں زیادہ دیر وہاں نہ رُک سکا اور پھر آنے کا کہہ کر چل دیا۔میں سیدھا پہلے دوست کے پاس گیا اور اُس سے رقاصہ کا ذکر کیا۔

''رقاصہ''، وہ بڑے عجیب انداز میں بولا۔

''تو پھر''؟ میں نے کہا۔

''کچھ نہیں''۔یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلا گیا۔

میں کچھ دیر تک اُس کے اس انداز پر غور کرتا رہا۔مجھے لگا کہ وہ میری کیفیت سمجھ گیا ہے اور اس پر طنز کر رہا ہے۔جو بھی ہو میں نے اب رقاصہ سے بات کرنے کا پختہ عزم کر لیا تھا۔اچانک خیال آیا۔

''رقاصہ، کیا میں رقاصہ سے۔۔۔۔۔''

اگلے دن کام پر میری ملاقات میرے دوست سے ہوئی ۔اُس کے ساتھ اور دوست بھی تھے ۔سب کام کے وقفے میں چائے پی رہے تھے ۔''آج کل بہت کم دکھائی دیتے ہو''۔ایک نے کہا۔

''چھوڑو یہ تو مجنوں ہو گیا ہے''۔میرے اس دوست نے کہا جو مجھے پہلی دفعہ وہاں لے کر گیا تھا۔

مجھے حیرت ہوئی کہ ''ابھی تو کچھ کیا بھی نہیں ہے اور ابھی سے یہ سب کچھ''۔

اچانک مجھے رقاصہ کے وہ الفاظ یاد آئے ۔مجھے کچھ سمجھ نہ آیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے ۔شام کو جب میں ادھر جا رہا تھا تو تنگ گلیوں میں سارے لوگ کھڑے کسی معمولی سی بات پر جھگڑ رہے تھے ۔ایک عورت فریاد کر رہی تھی ''کوئی میرے بچے کو بچاؤ۔خدایا کوئی تو رحم کرے''۔بہت سے لوگ کھڑے یہ ماجرا دیکھ رہے تھے ۔میں یہ ماجرا دیکھتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔مجھے رقاصہ کے گھنگھروؤں کی جھنکار اور پاؤں کی آواز سنائی دی، میں اندر داخل ہوا اور اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گیا۔داد کا وہی پُرانا سلسلہ جاری تھا۔ہمیشہ کی طرح مجھ پر ایک نشہ سا طاری ہو گیا۔رقص ختم ہوا تو کسی نے رقاصہ کو ایک

دن ساتھ لے جانے کا پوچھا۔

''جی ضرور''۔رقاصہ کی سرکار نے کہا۔

لیکن رقاصہ اس بات پر رضامند نہیں لگتی تھی۔یہ سنتے ہی اُس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے لیکن آخر کار اسے جانا ہی پڑا۔میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔اپنے گھر کی طرف لوٹتے ہوئے میرے دماغ میں کئی طرح کے خیالات کا ہیولا بنا ہوا تھا۔کبھی رقاصہ کا رقص، کبھی رقاصہ کے چہرے کے تاثرات، اسی ذہنی کشمکش کے دوران، ایک تیز رفتار کار سے میری ٹکر ہوگئی۔میں کچھ دنوں تک ہسپتال میں زیرِ علاج رہا۔اب مجھے یاد نہیں کہ میں کتنی دیر یا کتنے مہینے زیرِ علاج رہا تھا۔

صحت یاب ہوا تو ایک دن مجھے اُن گلیوں میں جانے کا خیال آیا۔وہاں سب کچھ بدل چکا تھا۔یہاں تک کہ گلیوں میں موجود چھوٹی چھوٹی دکانیں بھی بدل چکی تھیں۔میں سیڑھیوں سے ہوتا ہوا اوپر گیا۔دروازہ خلافِ معمول بند تھا۔دستک کے جواب میں کسی نے پوچھا،''کون''؟

''دروازہ کھولیے''، میں نے کہا

''رقاصہ اب یہاں نہیں ہے''۔اندر سے آواز آئی، جو رقاصہ کی سرکار جیسی تھی۔کچھ دیر تو میں حیران ہوا لیکن پھر فوراً ہی پوچھا''کہاں گئی''؟

سرکار نے مجھے ایک پتا بتا دیا۔

جب میں اُس جگہ پر پہنچا تو بہت سی بچیاں ہاتھوں میں قرآن لیے ہوئے باہر آ رہی تھیں اور کچھ عورتیں وہاں سے نکلتے ہوئے آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔

''میں یہاں جو بھی دعا کرواتی ہوں پوری ہو جاتی ہے۔خدا بھلا کرے معلّمہ کا''۔

جب میں دروازے پر پہنچا تو چوکیدار نے روک کر پوچھا''ارے کدھر''؟

''معلّمہ سے ملاقات کرنی ہے''۔میں نے کہا۔

''لیکن وہ تو مردوں سے ملاقات نہیں کرتیں''۔

(ردا رشید لمز کی طالب علم ہیں)

فرقان اشرف

انٹرویو: افتخار عارف

افتخار عارف عہدِ حاضر کے ممتاز شاعر اور دانشور ہیں۔ان کے شعری مجموعے مہر دو نیم، حرف باریاب، جہان معلوم، شہر علم کے دروازے پر اور کتاب دل و دنیا بہت مقبول ہیں۔ان کی شاعری پر کئی تجزیاتی مقالے شائع ہو چکے ہیں۔ان کی شاعری کا کئی زبانوں میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔افتخار عارف اردو مرکز لندن کے سربراہ رہے اور اس کے بعد اکادمی ادبیات پاکستان اور مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشین رہے ہیں۔آج کل ECO Cultural Institute (تہران) کے سربراہ ہیں۔

س: آپ کے نزدیک آج کے زمانے میں شاعری کا مقام کیا ہے؟

ج: افراد اور معاشرے کی ترجیحات مختلف ہوتی ہیں، لیکن بعض اوقات جو معاشرے کی ترجیحات ہوں وہی افراد کی ترجیحات ہو جاتی ہیں۔دیکھنے میں آیا ہے کہ معاشرہ بھی دولت کے حصول میں لگا ہوا ہے اور فرد بھی۔معاشرے کے نزدیک کامیاب آدمی کا معیار یہ ہے کہ کسی شخص کے پاس کتنے وسائل ہیں، لیکن بعض اوقات ذاتی حیثیت میں یہ معیارات مختلف بھی ہوتے ہیں۔اگر آپ مجھ سے پوچھیں تو شعر میری ترجیحاتِ اول میں شامل ہے۔میں نے ایک دفعہ اپنی بیٹی سے کہا کہ زندگی میں مجھے تم سے زیادہ کسی دوسرے شخص سے تعلق یا محبت نہیں ہے لیکن ایک جہت ایسی ہے جس سے مجھے تم سے بھی زیادہ محبت ہے اور وہ ہے شاعری۔

اب آپ بازار میں چلے جائیں تو دیکھیں گے کہ کتابوں کی دکانیں دن بہ دن کم ہوتی جاتی ہیں۔بہت کم پڑھنے لکھنے والے لوگ شاعری کی طرف متوجہ ہیں۔حتیٰ کہ امریکا اور یورپ وغیرہ میں بھی صورتِ حال کچھ ایسی ہی

ہے۔ پہلے جب آپ کتابوں کی دکان میں داخل ہوتے تھے تو آپ کو ادبی کتب زیادہ نظر آتی تھیں مگر اب وہ یا تو غائب ہوتی جارہی ہیں یا دوسری منزل پر چلی گئی ہیں۔

اتفاق یہ ہے کہ پہلے کی نسل گفتگو کے دوران اردو اور فارسی کے اشعار اور محاورے استعمال کرتی تھی۔ ہم بات بات پر کوئی محاورہ یا مصرع استعمال کرتے تھے مگر اب صورتِ حال مختلف ہے۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہے کہ بین الاقوامی سطح پر ہم نے شکست تسلیم کرلی ہے کہ انگریزی کو اردو پر فوقیت حاصل ہے۔ میں آج کل ایران میں ہوں اور دیکھتا ہوں کہ وہاں رہبرِ معظم سے لے کر عام آدمی تک ہر شخص فارسی میں گفتگو کرتا ہے۔ یہی صورتِ حال چین میں ہے۔

تہذیبی فلسفۂ تاریخ کے اعتبار سے مغلوب تہذیبیں غالب تہذیبوں سے متاثر ہوتی ہیں۔ مثلاً ہم نے دسترخوان کی بجائے کھانے کی میز سجالی، قالین کی بجائے صوفے رکھ لیے اور بگھیوں کی بجائے کاروں میں سفر کرنا شروع کردیا۔ یہ سب مادی کلچر کے بدلنے کے مظاہر ہیں۔ اسی طرح غیر مادی کلچر (non-material culture) بھی بدلتا ہے۔ مثلاً اب ہم خدا حافظ کی بجائے bye یا see you کہنے لگے ہیں۔

پہلے زمانے میں صدیاں اور علاقے شاعروں سے پہچانے جاتے تھے۔ Homer کا زمانہ، Milton کا زمانہ، حافظ کا زمانہ، رومی کی زمین، سعدی کی زمین وغیرہ وغیرہ۔ اب شاعری marginalize ہوگئی ہے۔ اب جیسے ہمارے ہاں لوگ Bob Dylan کو جانتے ہیں مگر Dylan Thomas کو کوئی نہیں جانتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ classical personalities ختم ہوتی جارہی ہیں۔ classical آدمی وہ ہوتا تھا جو تھوڑا فلسفہ جانتا تھا، تھوڑی موسیقی جانتا تھا، تھوڑا مذہب جانتا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ اپنا discipline بھی جانتا تھا۔ اب شاید ایسا ممکن نہیں ہے۔ اب specialization کا دور ہے۔

س: اگر کوئی شاعری کرنا چاہے تو یہ مشکل کام ہے۔ کیا آپ اس بات سے اتفاق کرتے ہیں؟

ج: مشکل تو نہیں ہے اور جو barriers تھے، مثلاً شاعری کی کلاسیکل گرامر، عروض وغیرہ، وہ سب بیسویں

صدی میں تہس نہس ہو گئے ہیں اور 'نیا آدمی' پیدا ہوا ہے۔ تاریخ میں ایسے آدمی پہلے بھی تھے جن پر نئے آدمی کی definition کا اطلاق ہوتا تھا مگر تاریخی طور پر جو بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں نئے آدمی کا وجود عمل میں آیا، بلکہ Virginia Woolf نے بیسویں صدی کے آغاز میں ہی کہا تھا کہ نئے آدمی کا وجود عمل میں آچکا ہے۔ اس نے form کو توڑ دیا اور کہا کہ ہم جیسے چاہیں گے لکھیں گے۔ ہم خود اپنے لفظ کے معنی متعین کریں گے۔ البتہ بڑا شاعر بھی پابندیوں کو توڑتا ہے۔ جیسے ڑ، ڈ، چھ کو hard voices اور ل، م، ن، وغیرہ کو soft voices سمجھا جاتا تھا اور شاعری میں اسی تخصیص سے استعمال کیا جاتا تھا۔ لیکن اقبال نے لکھا کہ:

لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب

بڑا شاعر اپنی زبان خود پیدا کرتا ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ سب لوگ ایک طرح سے محبت نہیں کرتے، سب لوگ ایک طرح سے خواب نہیں دیکھتے، چنانچہ سب ایک طرح سے شاعری بھی نہیں کرتے۔

اس کے علاوہ جو قومیں کسی مشکل سے گذرتی ہیں ان کے ہاں قوت کے ساتھ شعر لکھا جاتا ہے۔ جیسے ہماری فلسطینی شاعری ہے۔ عرب شعرا میں ایڈونس، محمود درویش اور حیدری نے بہت اچھی شاعری کی اور بہت قوت کے ساتھ شعر لکھے۔

اب ادب، ماسوائے ایک دو اصناف کے، صرف ادب کے اساتذہ اور طالب علموں کے لیے رہ گیا ہے، عام آدمی کا ادب پڑھنا کم ہو رہا ہے۔ novel یا travelogue پڑھے جا رہے ہیں۔ اور novel کے لیے تو سب سے زیادہ وقت درکار ہوتا ہے لیکن پھر بھی آپ بازار جائیں تو دیکھیں گے کہ novel یا long fiction سب سے زیادہ بکتا ہے۔

س: کیا شاعری نثر سے بہتر صنف ہے؟

ج: میں اس سے اتفاق کرتا ہوں، کیونکہ ادب کی عظمتیں انھیں لوگوں کو نصیب ہوئی ہیں جو شعر کہتے تھے۔ کم از کم تین ہزار سال کی شاعری فرد کے ساتھ منسوب ہے یعنی ان کے نام بھی آپ کو معلوم ہیں کہ یہ Homer کی شاعری

ہے، یہ Virgil کی شاعری ہے۔اُس زمانے میں نثر بھی لکھی جاتی ہوگی۔کوئی معاہدے ہوتے ہوں گے، کوئی خطوط لکھے جاتے ہوں گے۔وہ نثر اس طریقے سے موجود نہیں ہے، مگر شعر موجود ہے۔فردوسی، حافظ، سعدی، رودکی، خیام، رومی، سنائی اور عطار کا نام فارسی شعرا میں زندہ ہے۔ظاہر ہے کہ اگر آپ مؤرخین سے نثر نگاروں کی فہرست مانگیں گے تو وہ آپ کو دے دیں گے مگر ان کا نام شاعروں کی طرح زندہ نہیں ہے۔مثلاً جو Greek شعرا کا زمانہ تھا وہ ڈراما نگاروں کا بھی زمانہ تھا مگر شعرا کا نام آج بھی بدستور قائم ہے۔

بیسویں صدی میں صورتِ حال بدلی ہے۔اب عام آدمی ناول نگاروں کو زیادہ جانتا ہے۔

س: شعر کے عمل کو آپ کیسے بیان کریں گے؟

ج: مجھ سے اکثر لوگ پوچھتے ہیں کہ آپ شعر کیوں کہتے ہیں تو میں ایک جگہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میری مَت ماری گئی ہے۔بچپن ہی سے موزوں کر سکتا تھا۔میرے سکول کے زمانے کی ایک تحریر چھپی ہوئی بھی ہے۔وہ ایک خام تحریر ہے مگر موجود ہے۔میں جب کالج یا یونی ورسٹی میں تھا تو اپنے ہم جماعت طالب علموں کے بارے میں شعر کہتا تھا، اساتذہ کے بارے میں شعر کہتا تھا۔اب جب میں لکھنؤ جاتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ میری بہت سی تحریریں ان لوگوں کے پاس موجود ہیں۔جب میں مستقل طور پر پاکستان آیا تھا تو یہ میرے لیے ایک مختلف تجربہ تھا۔مثلاً میں یہاں اکیلا آیا اور مجھے یہاں identity کا مسئلہ درپیش تھا۔پھر رشتوں کی شکست و ریخت کا احساس پہلے نہیں تھا۔دوسری بات یہ تھی کہ پس ماندہ طبقے سے تعلق رکھنے کے باعث معاش کا مسئلہ تھا۔جب وہ مسئلہ حل ہوا تو دوسرے مسئلے سامنے آنے لگے۔مطالعے کا شوق ہمیشہ سے تھا۔اس نے بھی میرے لیے کچھ مسئلے پیدا کیے، مثلاً میں نے کلاسیکی اُردو شاعری پڑھی ہوئی تھی تو مجھے معلوم تھا کہ شاعری کس قدر مشکل کام ہے اور اس وجہ سے میرا کام اور بھی مشکل ہوگیا۔

س: آپ نے اپنی شاعری میں ''کربلا'' کے استعارے کو استعمال کیا ہے۔اس کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟

ج: جی ہاں! میرے بارے میں فیض صاحب نے بھی یہی ازراہ کرم لکھا ہے اور میرے دوست گوپی چند نارنگ نے بھی یہی بات کہی ہے۔ کربلا میرے نزدیک ایک تاریخی واقعہ تو ہے ہی مگر یہ ایک علامت ہے ظلم اور زیادتی کے خلاف مزاحمت کی۔ لہٰذا میں نے اس استعارے کو پاکستان اور تیسری دنیا کے ماحول میں لکھنے کی کوشش کی۔ جب میں نے پہلی مرتبہ اس کا استعمال کیا تو میرے کچھ جاننے والوں نے اس پر تنقید بھی کی۔

وہی پیاس ہے، وہی دشت ہے، وہی گھرانہ ہے
مشکیزے سے تیر کا رشتہ بہت پرانا ہے

انھوں نے کہا کہ یہ مرثیے کے شہر لکھنؤ سے آئے ہیں اور انھیں یہ بھی نہیں معلوم کہ کون سے موضوعات سلام کے ہوتے ہیں اور کون سے موضوعات غزل کے۔ میرے ایک دوست، محسن اور اُستاد سلیم احمد صاحب نے کہا کہ لوگ اپنی الٹی سیدھی محبوباؤں کے بارے میں غزل کہنے سے گریز نہیں کرتے تو تمھارے محبوب تو بہت خوبصورت ہیں۔

اس بات نے بہت تقویت دی اور میں نے یہ کام جاری رکھا۔ بعض نظمیں میں نے ایسی لکھیں جو موجودہ حالات کے مطابق تھیں۔ مثلاً جب بھٹو صاحب کو تخت سے اتارا گیا تو میں نے ایک نظم لکھی جو بہت مقبول ہوئی۔

وہ فرات کے ساحل پر ہوں یا کسی اور کنارے پر
سارے لشکر ایک طرح کے ہوتے ہیں

س: آپ کی کوئی ایسی نظم جو آپ کو بہت پسند ہو؟

ج: اس کا ایک بہت ہی فضول جواب تو یہ ہے جو تمام شاعر دیتے ہیں کہ اپنی سب اولاد ایک سی پیاری ہوتی ہے۔ لیکن یہ درست نہیں۔ کچھ بچے زیادہ پیارے ہوتے ہیں۔ اب اپنے بارے میں بات کرنا ناشائستہ ہے مگر میں عرض کروں بعض اوقات کسی کی لکھی ہوئی کوئی ایک ہی نظم آپ پر غالب آجاتی ہے۔ مثلاً احمد شمیم کی نظم ''کبھی ہم خوبصورت تھے'' ہمیں بہت پسند ہے۔ لیکن کبھی منیر نیازی کی کوئی نظم اچھی لگتی ہے اور کبھی عزیز حامد مدنی کی کسی نظم سے

محظوظ ہوتے ہیں۔کسی وقت ناصر کاظمی کی کوئی غزل ذہن میں آتی ہےتو پوری پوری رات اس کے ساتھ گذر جاتی ہے۔لہٰذا شاعری ہمارے لیے کوئی مشغلہ نہیں ہے۔یہ کوئی تفریح کا ذریعہ نہیں ہے۔یہ تو ہمارے لیے زندگی کا دوسرا نام ہے۔اگر فرض کیجیے دوسری زندگی ہو اور ہم سے کہا جائے کہ آپ کیا بننا چاہیں گےتو ہم بالکل شاعر بننا چاہیں گے۔ بالکل ازسرِ نو زندگی شروع کریں گےاور تب بھی شاعری کریں گے۔ہم یہی کر سکتے تھے۔میں نے کہیں لکھا بھی ہے۔

جیسا ہوں ویسا کیوں ہوں سمجھا سکتا تھا میں
تم نے پوچھا تو ہوتا بتلا سکتا تھا میں

چھوٹی موٹی ایک لہر ہی تھی میرے اندر
ایک لہر سے کیا طوفان اٹھا سکتا تھا میں

کہیں کہیں سے کچھ مصرعے ایک آدھ غزل کچھ شعر
اس پونجی پر کتنا شور مچا سکتا تھا میں

س: آپ کے خیال میں شاعروں کی ذاتی زندگی عام لوگوں سے مختلف ہوتی ہے؟

ج: کوئی خاص فرق نہیں ہوتا۔یہ خیال شاید شاعروں اور فنکاروں نے ایسے ہی مشہور کر رکھا ہے۔سبھی sensitive ہوتے ہیں لیکن بیان کرنے کی توفیق کسی کسی کو ہوتی ہے۔Picasso نے اپنے کسی انٹرویو میں کہا ہے کہ ہر بچے کے اندر ایک شاعر ہوتا ہے، ایک مصور ہوتا ہے اور اگر موقع دیا جائے تو اس کا شاعر باہر آسکتا ہے۔فیض صاحب نے لکھا کہ شاعر بننے کے لیے مشاہدہ، مجاہدہ اور مطالعہ ضروری ہے۔میں اس میں توفیق کو شامل کرتا ہوں۔پھر آپ کو محنت کرنی پڑتی ہے، سیکھنا پڑتا ہے۔مثلاً آپ غزل کہنا چاہتے ہیں، اگر آپ کو یہی نہیں معلوم کہ وزن کیا ہوتا ہے، قافیہ کیا ہوتا ہے، ردیف کیا ہوتی ہے، بحر کیا چیز ہے۔تو آپ کیسے لکھیں گے۔آپ کو پتا ہونا چاہیے کہ جو آپ سے پہلے شاعر تھے وہ کیسے شاعر تھے، انھوں نے کیا لکھا ہے۔اس سب کے لیے آپ کو مطالعہ کرنا ہوگا۔بعض اوقات آپ کے ذاتی حالات ایسے ہوتے ہیں کہ آپ لکھ نہیں سکتے۔مثلاً Soviet Union کے قیام کے وقت Marina Tsvetaeva

پیرس چلی گئیں ۔وہ روسی زبان کی بڑی شاعرہ ہیں۔پیرس میں ایک ریستوران میں کام کیا تو ایک خط میں لکھا کہ ریستوران میں کام کرنے کے باعث ہاتھوں میں مچھلی کی بو اس قدر آجاتی ہے کہ مجھ سے شعر بن نہیں پاتا۔

غزل کو مکمل کرتے کرتے مجھے ایک دو مہینے بھی لگ جاتے ہیں مگر نظم میں ایک نشست میں لکھ لیتا ہوں۔ میں شعر میں بہت محنت کرتا ہوں اور مکمل عبادت کی طرح شاعری کرتا ہوں اور جب تک دل مطمئن نہیں ہو جاتا تب تک اس پر کام کرتا ہوں۔

مرے خدا مجھے اتنا تو معتبر کر دے
میں جس مکان میں رہتا ہوں اس کو گھر کر دے

مری زمین مرا آخری حوالہ ہے
سو میں رہوں نہ رہوں اس کو بارور کر دے

افتخار عارف

نمود، شمارہ ۳، ۲۰۱۴ء

عزیز حامد مدنی
(۱۹۲۲ء_۱۹۹۱ء)

آخری رات

آج مرے دل کی ویرانی
دھیرے دھیرے بول اٹھی ہے
میرا کام نہیں سمجھانا
لیکن کس کو راس آیا ہے
ایسی رات میں باہر جانا
راہ سوالوں کا اک بن ہے
بے مشعل بے مونس چلنا ہے
یہ سب اک دیوانہ پن ہے
گشت میں ہے کتوال نگر کا
اس کی آنکھوں میں نقشہ ہے
سب گلیوں کا سارے گھر کا
اور تم دیوانے ہو اب تک
پاؤں کا تم کو ہوش نہ سر کا

لیکن مجھ ایسے دیوانے
بیٹھ کے کیسے جی سکتے ہیں
ایسا عشق سبق دیتا ہے
مکتب کے دروازے ہی پر

کفش و کلہ رکھوا لیتا ہے

حرف صداقت لکھواتی ہے
تختی لکھنا کھیل نہیں ہے
دل کی طاقت لکھواتی ہے
دل رکھے تو ہمت رکھے
جرم عشق کیا ہو جس نے
وعدۂ یار کی عزت رکھے
عشق پہ ہے تعزیر پرانی
میرے لب سے کیوں رسوا ہو
اندھوں میں سچ کی عریانی

رات اندھیری ہے اے دلبر
لیکن جب بھی آنکھ لگی ہے
کوئی کرن سا نازک خنجر
دل کے اندر گھوم گیا ہے
دست ستم سے پہلے آ کر
میری چوکھٹ چوم گیا ہے

نمود شمارہ ۳، ۲۰۱۴ء

سلیم احمد

(۱۹۲۷ء۔۱۹۸۴ء)

غزلیں

دلِ حُسن کو دان دے رہا ہوں
گاہک کو دُکان دے رہا ہوں

شاید کوئی بندۂ خدا آئے
صحرا میں اذان دے رہا ہوں

ہر کہنہ یقیں کو از سرِ نو
اک تازہ گمان دے رہا ہوں

گونگی ہے ازل سے جو حقیقت
میں اُس کو زبان دے رہا ہوں

میں غم کو بسا رہا ہوں دل میں
بے گھر کو مکان دے رہا ہوں

جو فصل ابھی کٹی نہیں ہے
میں اُس کا لگان دے رہا ہوں

حاصل کا حساب ہو رہے گا
فی الحال تو جان دے رہا ہوں

رکھوں جو لحاظ مصلحت کا
کیا کوئی بیان دے رہا ہوں

ꕥ

ٹھیر جاتے ہیں کہ آدابِ سفر جانتے ہیں
ورنہ منزل کو بھی ہم راہگذر جانتے ہیں
نامرادانِ محبت کو حقارت سے نہ دیکھ
یہ بڑے لوگ ہیں جینے کا ہنر جانتے ہیں
شرطِ ویرانی سے واقف ہی نہیں شہر کے لوگ
در و دیوار بنا کر اُسے گھر جانتے ہیں
دیکھ اے دستِ عطا تیری غلط بخشی کو
یہ الگ بات کہ ہم چپ ہیں، مگر جانتے ہیں
ان کو تسکینِ حضر دے کہ ترے خانہ بدوش
گھر کو منجملۂ اسبابِ سفر جانتے ہیں
ہر طرف معرکۂ سود و زیاں جاری ہے
دستِ خالی کو سلیمؔ اپنی سپر جانتے ہیں

نمود، شمارہ ۳، ۲۰۱۴ء

اسد محمد خاں

ریڈیو والے نواب صاحب

اس وقت تک بجلی سب گھروں میں نہیں آئی تھی، اور ریڈیو تو محلے میں کسی ایک گھر میں ہوتا ہوگا۔ بہت سے محلے تو ایسے تھے کہ وہاں ریڈیو والا گھر بھی نہ تھا۔ ہمارے محلے میں نواب صاحب کے ہاں بجلی بھی تھی اور ریڈیو بھی۔ دوسری عالمی جنگ چھڑی ہوئی تھی اور ہمارے دادا کی تسلی صرف اخبار پڑھ کر نہیں ہوتی تھی۔ پھر نواب صاحب کی ان کی دوستی بھی بہت تھی، اس لیے جب نواب صاحب نے بار بار مدعو کیا تو دادا بھی ریڈیو سننے جانے لگے۔

ہماری حیثیت دادا کے اے ڈی سی کی تھی، چناں چہ نواب صاحب کی ریڈیو والی محفل میں ہم بلا ناغہ شریک ہوتے تھے۔

نواب صاحب کی ڈیوڑھی میں جہاں شام کو فرش دُھلنے کے بعد صندوق کا صندوق ریڈیو اٹھا کر لایا جاتا اور فرش میں تقریباً نصب کیا جاتا تھا، مہمانوں کی بھاری بھرکم کرسیوں کے ساتھ ہمارے لیے بھی بنا ہتھوں کی ایک چھوٹی کرسی بچھنے لگی۔ ہماری کرسی دادا والی کرسی اور نواب صاحب کی آرام کرسی کے درمیان ڈالی جاتی تھی، وہ اس لیے کہ ہم دادا کے قرب کی وجہ سے ڈسپلن میں بھی رہیں اور ریڈیو کی نیلی آنکھ کو آوازوں کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ جھپکتے ہوئے بھی دیکھتے جائیں، کیوں کہ ریڈیو کی گھن گرج اور اس کی بھاری بھرکم موجودگی میں ایک یہی چیز ہماری دلچسپی کی تھی۔ نواب صاحب کی آرام کرسی کے قریب اسے بچھائے جانے کا ایک فائدہ، یا نقصان، یہ ہوا کہ ہمیں نواب صاحب کو قریب سے دیکھنے اور محلے کے بچوں کے لیے ان کی جاسوسی کرنے کا بہت اچھا موقع مل گیا۔ ان کے لباس، کنجوسی اور حد سے بڑھی ہوئی صفائی پسندی کے سوا، بہ ظاہر، کوئی ایسی بات نواب صاحب میں نہیں تھی جو محلے کے بچے اور افواہ

پسند لوگ ان میں دلچسپی لیتے۔ہم نے ایک خاص بات ضرور نوٹ کی تھی کہ نواب صاحب مسکراتے بہت کم تھے اور ضرورت پڑے تو یہ کام وہ بڑی خست سے کرتے تھے، جیسے مسکرانے میں بھی کچھ خرچ ہوتا ہو۔اسی طرح کپڑوں کا معاملہ بھی تھا۔وہ اپنے گھر میں، یا گھر کے سامنے سڑک پر ہوتے تو چوخانے والی تہ بند اور بے داغ سفید نیم آستین پہنے رہتے۔ یہ نیم آستین واسکٹ سے بس اتنی مختلف تھی کہ واسکٹ میں کہنیوں تک آستینیں نہیں بنائی جاتیں۔نواب صاحب یہ لباس اور کھڑاویں اپنے گھر میں اور گھر کے عین سامنے تک پہنے رہتے تھے؛ اگر انھیں دس قدم سڑک پار کر کے ہمارے گھر بھی آنا ہوتا تو وہ پورے لباس میں آتے تھے، یعنی شیروانی اور شیروانی ہی کے کپڑے کی ٹوپی، ڈھیلا پے جامہ اور سیاہ یا بادامی پیٹنٹ چمڑے کے پمپ جن پر اسی رنگ کی ریشمی تتلی ٹکی ہوئی۔

نواب صاب مراق کی حد تک صفائی پسند تھے۔گھر کا تو ذکر ہی کیا، انھیں سامنے سڑک پر بھی بے ترتیبی برداشت نہیں ہوتی تھی۔شاید یہی ان کی نامقبولیت کی اصل وجہ تھی۔

ہمارے علاقے کے لیے یہ لباس اور اتنی صفائی پسندی کچھ انوکھی سی بات تھی۔پھر نواب صاحب، جو محلے کے سب سے آسودہ حال آدمی تھے، اس وجہ سے بھی مقبول نہ ہو سکے ہوں گے کہ کنجوس تھے۔ہم بچوں کو تو ان کی کنجوسی سے کوئی زیادہ سروکار نہیں تھا، ہاں محلے کی ذیلی گلیوں میں کچھ فاصلے پر جو لوگ رہتے تھے انھیں اس بات کا بہت قلق تھا کہ نواب صاحب کے گھر کوئی تقریب کیوں نہیں ہوتی۔ان کے گھر کبھی دیگیں نہیں کھڑکتی... کوئی اولاد ہی نہیں تھی جو سب پھلاوا کیا جاتا۔قریب و دور کے عزیز شاید اس بات پر ناراض بھی رہتے تھے کہ اس قدر مال و متاع کے باوجود نواب صاب یا ان کی بیگم کوئی بچہ کیوں نہیں گود لے لیتے۔

ہمیں نواب صاحب سے بس اتنی شکایت تھی کہ ایک مدت سے ان کی ریڈیو محفل میں شرکت کر رہے تھے، پھر ہم بچے بھی تھے، کبھی جو ہمارے لیے اندر سے کوئی بسکٹ، ٹافی یا پھل انھوں نے منگوایا ہو۔نوکر ایک جہازی قسم کا پیچوان ضرور اٹھالاتا تھا، یا بلور کی طشتری میں پندرہ بیس الائچیاں رکھ جاتا تھا۔پیچوان اور الائچیاں، ہمارے لیے دونوں ہی بے کار تھیں۔پیچوان تو دادا تک کے لیے بے کار تھا۔

محلے کے لڑکوں، اور گاہے گاہے ذیلی گلیوں میں رہنے والوں نے اپنی ناپسندیدگی اور ملال کے اظہار کا ایک

طریقہ یہ نکالا کہ نواب صاحب کی دیوار پر یا ان کے بڑے پھاٹک پر کوئلے، گیرو یا کالک سے لکیریں کھینچ دیتے، یا آدمی، درخت یا چڑیا کی شکلیں بنا دیتے تھے، جو اس زمانے میں بہت آسانی سے چند ہی لکیروں میں بن جاتی تھیں۔ دیواروں پر کافر وغیرہ لکھنے کا رواج نہیں تھا، ورنہ وہ بھی ضرور لکھا جاتا۔

یہ بدرنگ لکیریں اور شبیہیں جیسے نواب صاحب کے دل پر خراشیں ڈال دیتی تھیں۔ وہ اپنی نیم آستین، تہ بند اور کھڑاویں پہنے، کوچی، تسلا یا رنگ کا ڈبا اٹھائے گھر سے نکلتے، اور لاحول پڑھ پڑھ کر انھیں مٹانے یا ان پر پلستر کرنے کا جتن کرتے۔ اور لکیریں اور شبیہیں بنانے والے دوذیلی راستوں اور گلیوں کے موڑ پر کھڑے نواب صاحب کو اور ان کے نوکر کو ہلکان ہو ہو کر لکیریں مٹاتے، سفیدہ اور رنگ پھیرتے دیکھتے اور خوش ہوتے۔

بہت سے لوگ نواب صاحب کے خلاف افواہیں اڑا کر بھی دل کا غبار نکالا کرتے تھے۔ ایک مقبول افواہ، جو ہمارے گھر میں بھی گشت کر چکی تھی، یہ تھی کہ ان کی زمینوں، باغوں سے جو اعلیٰ قسم کے آم اور دوسرے پھل آتے ہیں، نواب صاحب اپنے گھر والوں تک کو نہیں کھانے دیتے، شیروانی، ٹوپی اور پمپ شوز پہن کر خود جاتے ہیں اور ریل کی بلٹی چھڑا کر براہِ راست ساری پیٹیاں پھل بازار میں نیلام کر آتے ہیں۔

اس افواہ کو اس لیے تقویت پہنچتی تھی کہ نواب صاحب نے کبھی جیتے جی ہمارے گھر بھی چار آم نہیں بھیجے۔ ہاں ان کے انتقال کے بعد، لوگ بتاتے ہیں کہ جب تک بیگم زندہ رہیں، موسم کے پھل پیٹیوں کے حساب سے ہمارے ہاں بھیجتی رہیں۔

دادا کے سوا سب کو امید تھی کہ ایسے نامقبول اور بے رابطہ آدمی کی زندگی تو خیر تھی ہی، موت بھی بڑی پھسپھسی ہوگی، مجال ہے جو گھر والوں کے سوا کوئی آنکھ نم ہو جائے۔ مگر نواب صاحب نے تو مر کے بھی سبھی کو حیران اور اکثر کو شرمندہ کر دیا۔

بتاتے ہیں کہ فجر سے پہلے ان کا انتقال ہوا اور کہیں عصر کے بعد جا کے دفن کرنے کی نوبت آئی۔ خدا معلوم کہاں کہاں سے، کیسی کیسی سواریوں پر اور پیدل، کس کس شکل وصورت کے لوگ آنا شروع ہوئے ہیں کہ سڑک کا تو ذکر ہی کیا، تمام ذیلی راستے اور گلیاں میلے کچیلے کپڑے والوں، دھول بھرے بالوں اور پسینے میں شرابور چہرے والوں

سے، اور برہنہ پا لوگوں سے بھر گئیں۔ ان میں کئی مذہبوں مسلکوں کے لوگ تھے اور سب اپنے اپنے طریق پر نواب صاحب کی نجات کی دعا کرنے آئے تھے۔ یہ سبھی پہلی بار اُجالے میں اس بڑی سڑک پر آئے تھے اور دن کی تیز روشنی میں آنکھیں پٹ پٹا رہے تھے۔ یہ سب وہ لوگ تھے جو مکان کے پچھلے دروازے پر رات کے اندھیرے میں آتے تھے اور مہینے میں جب بھی ضرورت پڑتی تھی اپنی پنشن لے جاتے تھے۔

نواب صاب کی اس چوری چھپے کی کاروائی میں صرف ان کی بیگم اور نوکران کے ہم راز تھے۔

آج ان کو گذرے کوئی پینتالیس، پچاس برس ہو گئے ہیں، جب بھی بھولے بسرے زمانے کے اس بھلے مانس کو یاد کرتا ہوں، ذہن میں تصویر بنتی ہے تو یہی کہ مراق کے حد تک صفائی پسند نواب صاحب گھسی ہوئی بے داغ نیم آستین، تہ بند اور کھڑاویں پہنے بہت سے میلے کچیلے، پٹے ہوئے اور محروم لوگوں میں گھرے بیٹھے ہیں اور کنجوسی کے ساتھ مسکراتے ہوئے مٹھیاں بھر بھر کر سکّے اور نوٹ اچھال رہے ہیں۔

دائم آباد رہے گی دنیا
ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہو گا

ناصر کاظمی

قاضی نذر الاسلام
بنگلہ سے ترجمہ: محمد یوسف صدیق

انسان

انسان ہوں میں ۔۔۔۔۔
برابری کے گیت گاتا ہوں میں
کوئی برتری نہیں
انسان کی انسانیت سے بڑی
کوئی ذی نفس ہو کسی قوم کا
کوئی فرد ہو اور کوئی ذات ہو
کوئی ملک ہو اور کوئی راج ہو
نہیں فرق انھیں کسی طور سے
یہ سب ایک ہیں، کہ انسان ہیں
ہو کیونکر غرض فرقہ و نام سے
یہ وہ زنجیر ہے، جس سے آزاد ہوں
انسان ہوں میں
جو ہر گھر میں ہے اور ہر ملک میں ہے
ہر ایک قوم نے گیت گائے ہیں جس کے

(محمد یوسف صدیق لمز میں عربی زبان کے استاد ہیں)

Bushra Shehzad

Zahid Dar's "Mērā Pāgalpan"

Zahid Dar was born in Ludhiana in 1936 in undivided India. After completing his matriculation, he went on to study at the Government College, Lahore. He went to college for almost two years but never finished his bachelors. He found Economics distasteful and boring and only went to college "to discuss literature with friends" (Zia). All he ever wanted to do was to read, having realized at a very young age that he was not cut out for any sort of work that could sustain him. His family and friends would often ask him to find work and he did for a while but he felt he was wasting his time. In 1958, while on his way to the factory he was working at, he fell down unconscious and got sick (Zia). From that day on, he never worked again. His siblings promised to feed him and clothe him while he read. Dar also had a great deal of interaction with women, something that is also reflected in some of his poems, such as "Wo din mujhē āj bẖī yād hai". However, most of his other work is reflective of his own personality and the 'condition' he found himself in. His first works to be published were a collection of what he called his diary entries as he used to write his diary in poetic form (Zia). Initially, Dar was writing under a pseudonym and called himself Madho and only started using his real name much later. His first works were published in a magazine called *Sāt Raṅg* and later a compilation of his poems was published under the title, "Tanhā'i*"*.

In Dar's words, he writes only about the limited experience he has had. However, if one were to cage his ideology and writing under a label, he is a post-modernist. Whether or not directly influenced by Foucault, Marx, Nietzsche and Freud, his work revolves around many similar concepts. He was many things, a romantic, a secularist, a Marxist; yet he found himself frustrated and disappointed by any or all of these things. His poem, "Mērā Pāgalpan" (My Madness) which will be discussed in this essay is reflective of his life, his experiences, his thoughts and his ideologies.

In the first verse of this poem, Dar constructs a physical existence for his *pāgalpan* (insanity).

> *"Mērē pāgalpan kī dīvāroṅ pē āvāzoṅ kā khēl*
> *Mērē pāgalpan kī dīvāroṅ pē tasvīroṅ kā nāch*"

The repetitive usage of the word *dīvāroṅ* (walls) puts his 'insanity' into a confinement, literally drawing a wall around him. Insanity, of course is used as a metaphor here to represent the refusal of an individual's non-compliance with the social constructs of the world. The sounds and the images on these walls could be the ways in which the society sees and hears the world. And then he says,

"Mērē pāgalpan kī dīvāroṅ pē chup kē qaihqahē"

At once, the confinement that his insanity has created makes him realize his loneliness. "Chup kē qaihqahē" creates a stark, eerie picture and heightens his sense of loneliness. The feelings he has just described makes him question the existence of things and thins that could be. The poet seems confused, almost desperate for answers:

"uljẖē uljẖē sē savāl"

He asks these questions in the next verse. He questions the rigidity of man's resolve to mould everything into specific definitions and call them thus. Noon Meem Rashed's poem, "Zindagī sē ḍartē ho" puts this very irrational link between language and objects very aptly, *"Harf aur maʿāi kē rishta hā'i āhan sē, ādmī hai vābastā"* (Rashed). Dar questions this rationality and the need to comply with it. He feels confused as to why man feels this need to put himself into such unnecessary complexities. After all, everyone is born the same way, and everyone has to die the same way too. Why then does he feel this need to make others conform to his ideals. He does not see how one man's individuality, non-conformance should matter to another man. He refuses to understand the rationale behind it. To Dar, the concept of individuality is very important, and his insanity is what gives him his identity, his individual self. He does call these questions useless *(bēkār)* but at the same time he calls his insanity his life's sustenance. He beautifully puts it thus:

"Mērā pāgalpan, merā īmān mērī zindagī kā āsrā"

It seems like he is almost vowing to himself and to the society that he will not comply, he will conform, for to him, what he thinks and how he perceives it is his faith and the sustenance of his life. It is what keeps him going. It is his individual understanding of life, the people and the world that makes him want to continue living and be content in this confinement that is imposed on him:

"Mērā pāgalpan … mujẖē yē khudkushī sē roktā hai"

In the second last verse, he takes the tyrant ruler and those who could be his sympathizers and flips the qualities of tyranny and sympathy. Because he does not comply with the social constructions of the world, he feels he is protected from the false promises of dictatorial rulers. However, it also distances him from his sympathizers or like-minded people for that matter. Dar's poem, "Mērā Pāgalpan" reminds one of Khalil Gibran's "The Madman". Gibran talks about a man running around in a marketplace, who has lost his seven masks. These masks are metaphors for the various faces and facades man creates for himself in order to be accepted by society because what he truly is, how he truly thinks is too 'hideous' to be unmasked to the society; a hideousness society only deals with by incarcerating the non-conforming individual. But once these masks are gone, man is free: an individual who can think and act freely. "And I have found both freedom and safety in my madness; the freedom of loneliness and the safety from being understood" (Gibran 5). Dar talks exactly about this freedom in the poem discussed above, a freedom that can only be attained by embracing this 'insanity' and be called a 'madman'.

(Bushra Shehzad is a student of LUMS)

Works Cited

Gibran, Khalil. "The Madman." 2007. *Khalil Gibran: The Collected Works*. N.p.: Alfred A. Knopf, 2007. 5. Print.

Rashed, Nazar M. "Zindagī sē ḍartē ho." *Mavra*. N.p.: n.p., n.d. N. pag. Print.

Zia, Farah. "Literate, NOS, The News International." *The News International*[Lahore] n.d.: n. pag. *Literati, NOS, The News International*. Jang Group of Newspapers. Web. 06 Apr. 2014. <http://jang.com.pk/thenews/jul2009-weekly/nos-26-07-2009/lit.htm>.

زاہد ڈار

میرا پاگل پن

میرے پاگل پن کی دیواروں پہ آوازوں کا کھیل
میرے پاگل پن کی دیواروں پہ تصویروں کا ناچ
میرے پاگل پن کی دیواروں پہ چپ کے قہقہے
اُلجھے اُلجھے سے سوال

یوں نہیں' پر یوں اگر ہوتا تو کیا؟
چاند کاغذ' آسماں پتھر اگر ہوتا تو کیا؟
پیٹ میں اس دیس کے ننھا سا اک سورج اگر ہوتا تو کیا؟
آدمی پیدا ہوا' پانی میں ڈوبا' خشک ٹہنی پر چڑھا' پاپوں کی
اگنی میں جلا' وہ مر گیا

کس لیے.....؟
میرا پاگل پن یہی بے کار باتیں' بہکے بہکے سے سوال
میرا پاگل پن' مرا ایمان' میری زندگی کا آسرا
میرا پاگل پن مجھے جھوٹے خداؤں کے مظالم' نیک لوگوں کے ترحم
سے بچاتا ہے

میرا پاگل پن مری کمزوریاں مجھ سے چھپاتا ہے' مجھے یہ
خودکشی سے روکتا ہے۔ میرا پاگل پن.....

Noor Habib

Man in the Metropolis: Exploring the Possibility of *flânerie* in Intizar Husain's *Bastī.*

"Sahibzādē! Sārā din kahāṅ rahē?"
"Hakīm jī,Pakistan dēkẖ rahā tẖā"

"My dear boy! Where were you all day?"
"Hakim-ji, I was looking at Pakistan. (90)"

Zakir is the apathetic protagonist of Intizar Husain's widely acclaimed novel *Bastī.* Zakir's distracted gaze colors the novel's landscape while his jaded voice relays the story. Zakir is akin to Hamlet because of his tendency to delay action, and reminiscent of Monsieur Meursault, the unperturbed nihilist from *L'ètranger*. In his own words, he is "a poor teacher, cowardly and full of self doubt" *(ēk muʿallim gharīb buzdil-o-tarsanda jān)* (Husain, 197). We see Zakir most often wandering through streets, drifting in and out of his memories, and exploring the city of Lahore in the style of a flâneur; "I had started out in this city as a wanderer" *(maiṅ nē is shehr maiṅ ēk āvāra gard kī haisīat sē āghāz kiya)* (104). Through Zakir, the reader experiences the urban milieu and the landscape of the city as it is constructed and then destroyed before him. This essay will be a close examination of the relationship between Zakir and the metropolis; how the city enables Zakir's growing detachment, informs his attitude, and intensifies his loneliness and emotional distresses. I will argue that while Zakir does indulge in *flânerie* to some extent, the term falls short of describing the experience of Zakir in Lahore in all its iridescent complexity- Zakir does not merely wander in the city, but is eventually swallowed by the city, he, in effect, *becomes* the city itself.

Flânerie and Zakir; Observing Lahore

Walter Benjamin, in the *Arcades of Paris*, describes a flâneur as someone who 'stands on the threshold of the metropolis' and 'seeks refuge in a crowd' (10). He strolls along busy streets, scouts the marketplace and responds to the beckoning of the city. The concept was popularized by the poet Charles Baudelaire, who viewed the city of Paris to be worthy of poetic appreciation and

scrutiny.[1] For Zakir, the city is a new and intriguing place, which charms and betrays him simultaneously. He is a bourgeois dilettante, unencumbered by politics or religion and therefore free enough to spend his time in Anārkali bazaar, Mall Road and Shiraz tea house in an attempt to distract himself from the nostalgia that consumes him. The problems, of course, reside in his being and he carries them everywhere. After the partition in 1947, Zakir's family moves to West Pakistan, where they live in a considerably smaller rented house. However, it is in the violence ridden streets of Lahore that Zakir seeks a home. His wandering is aimless, but he is a careful and keen observer of his surroundings. For example, in one instance he

> "found Mall Road [to be] peaceful…Now there was peace, and the road was clean from one end to the other. No scattered bricks, no fragments of glass. The flow of traffic moved evenly. Cars traveling at their ease, a second after the first, a third after the second." (*Mall Road āj us nē pur sukūn pāyā. Saṛak yahāṅ sē vahāṅ tak sāf ṯẖī. Na īṅṭaiṅ paṛi hūi na shīshē kī kirchīāṅ bikẖrī hū'i. Traffic ēk hamvārī kē sāṯẖ ravāṅ davāṅ ṯẖā. Ārām sē chalti kār-ēn, ēk kē pīchẖē dūsrī, dūsrī kē pīchẖē tīsrī)* (83).

Later on in the story, he ventures into Anārkali bazaar. As Benjamin notes, the *flâneur* is someone who maneuvers himself with particular fluency in the marketplace.

> Anarkali Bazaar partly closed, partly open. A few shops here and there open, the rest shut up and locked. The bazaar crowded, but no one buying. He went out and came to a big road. Mall Road, horse-carts, bicycles, an occasional car, a few buses passing from time to time. (*Anārkali kuchẖ khulā kuch band- jahāṅ tahāṅ ko'i dukān khuli hū'i, bāqīoṅ maiṅ tālē paṛē hū'ē- hujūm bohut, kharidār ghāeb- vo vahāṅ sē nikal kē ēk baṛī saṛak par āyā- Mall Road, tāngē, sāikalēṅ, ko'i ko'i kār, waqfē waqfē sē guzartī hū'i ikkā dukkā bus)* (89).

[1] Painters like Manet incorporated this perspective into their compositions (a famous example is of *'Bar at the Folies Bergères'*, 1882).

Zakir's observations are astute and detailed- the rickshaws, buses, cars, cafés, the buildings, bazaars-nothing escapes his gaze. He scrutinizes his environment and tries (it appears) to sync the rhythm of his heart to the rhythm of the city. From observing smashed windows on cars to noting the anxiety in the eyes of a pedestrian, Zakir records everything;

> He was amazed: yesterday it seemed that all the cars in the city had had their windows broken, but now all the cars in the city were in fine condition…now the pedestrians' eyes showed no anxiety or astonishment (*hairān ho rahā hai kē kal to lagtā tẖā kē shehr kī sab kāroṅ kē shīshē chiknā chūr ho chukē haiṅ magar yē to shehr kī sab kārēn salāmat haiṅ… is rāh se guzarnē vāloṅ kī āṅkẖoṅ mēṅ ko'i tajassus ko'i hairat nahiṅ tẖī)*
> (83).

Zakir forges a silent camaraderie with the strangers on the street. He is quick to ascertain a situation just by glancing at their facial expressions, as if that was all he needed to gauge what was about to occur. In one instance, Zakir notes the passers-by; "he lifted his eyes and glanced around…He saw a few small groups standing still or slowly walking along, talking among themselves, with drained, collapsed faces. Why are all their faces drained and collapsed? With fear?" (*is nē pẖir ēk martabā jāizā līā…jahāṅ tahāṅ ko'i ṭolī kẖaṛī hū'i ya āhista āhista chaltī hū'i nazar ā'i āpas mēṅ kucẖ bātēṅ kartē hū'ē aur chehrē sauṅtē sauṅtē. Yē sab chehrē sauṅtē sauṅtē kyūṅ haiṅ? Khauf sē?)* 189). Even though they are all strangers to him, he thinks of them as his closest friends. The 'crowd' is a character in the novel with a distinct face and personality.

Whether as an expression of joy, or a way to deal with sadness, Zakir finds himself on the streets. He spends his initial days in Lahore savoring every moment of his leisurely walks around the city; "[t]he whole day I walked on a fresh earth under a fresh sky, suffused with happiness" (*mai din bhar aik tāza zameen par aik tāza āsmān talay khushi se sar shār chalta raha)* (91). The very act of walking a long distance is enjoyable for him: "He was enjoying this new earth very much. From one street to another, from the second to a third, he lost track of time as he walked on, but he never felt the least bit tired" (*Isē na'ī zamīn par chalnē maiṅ kitnī lazzat mil rahī tẖī. Ēk saṛak sē dūsrī saṛak par, dūsrī saṛak se tīsrī saṛak par jānē vo kitnī dēr chaltā rahā, magar zarā jo tẖakā ho)* (90).

On the other hand, when he is restless, he meanders around the same city in search for some kind of distraction or comfort. (*maiṅ andar sē khāli khāli, bāhar sē bēzār, shehr maiṅ bḫaṭaktā pḫirtā hūn)* (113). It is the act of seemingly aimless wandering itself which holds a special charm and significance for the *flâneur*. Where does Zakir need to go? In his own words: "Nowhere really" (*Kahiṅ bḫi nahīṅ)* 192). Consider the following exchange between Zakir and his friend.

Zakir: "I've walked a lot today." Irfan: "Why?" Zakir: "I just did."	*Zakir: "Āj bohut chalā hūṅ" Irfan: "Kyūṅ?" Zakir: "Bus vaisē hī"* (192).

Given that Zakir is an historian, this *flâneur*-esque gaze can be likened to the gaze of the disinterested recorder of history, a scribe. Not only does Zakir teach history as a subject, but it also actively involved in presenting and preserving history through his journal entries. His perspective is perhaps appropriate for an historian- detached and impartial.

Not only does Zakir explore the spatial landscape of the city, he performs a similar stroll in and out of memories, dreams, stories and history. He does not limit himself to spatial wandering but is also obsessed with temporal travel. Sometimes he would find himself to be "drenched in memories, self-absorbed, detached from the outside world" (*yādoṅ sē shādāb chalā tḫā, apnē āp mēṅ magan, bāhar sē bē-taʿlluq*) (60). Then suddenly, he would "come back from the zone of memories the way a sleeper might suddenly awake" (*vo to yādoṅ kē mantaqē sē aisē vāpis āyā thā - jaisē sotē sotē koʾi dafʿatan jāg uṭḫē*) (70). Lapsing into historical asides, sometimes emerging from a dream, at times stuck in the nostalgia for Rūpnagar, Zakir travels through both space and time, memory and longing.

Private Man in a Public Space; on Walking and Ruminating

The two things that characterize Zakir are, first, his tendency to wander and second, his habit of getting lost in thought. The two almost always happen simultaneously. Walking, thus, is a cathartic activity for Zakir. His *flânerie* is not merely casual or idle strolling- Zakir is riddled with existential dilemmas and is never mentally at ease. Walking is therefore an opportunity for him to remember, to forget, to "dive into his thoughts" (*khayālōṅ mēṅ ghautē lagātā*) (53). His

thoughts wander just as he wanders around the city and he finds that his reveries take him into faraway places and distant times.

> Normally, while he walked he thought about so many things, and while he was thinking he found himself ending up in one place or another… He was walking alone in the empty city, and the whole air was echoing with the sound of his two feet. (*Vo kē chaltē chaltē kitnā kuc̱ẖ sochtā t̲h̲ā aur sochtē sochtē kahāṅ kahāṅ nikal jātā t̲h̲ā. Tēz tēz uṭ̲h̲tē qadam, qadmoṅ kē shor mēṅ kān paṛī āvāz sunā'i nahīṅ dē rahī t̲h̲ī…vo khālī shehr mēṅ akēlā chal rahā thā)* (189)

Tea-House Culture and the significance of the Shiraz

One important aspect of city life is the café (Tea-house) culture that Intizar Husain captures so superbly in this novel. The 'tea-house' (in the form of Imperial and Shiraz) is emblematic of intellectual discourse and public debate; a subtle allusion to the actual Pak-Tea House in Lahore, where writers and poets (including Husain himself) would often come and talk about politics and literature over several cups of tea, just like in the Shiraz. The Tea-House is where the intellectual elite (the educated middle class) congregate in order to debate lofty political ideals. That is the extent of their 'activism'. The portrayal and function of the Shiraz in *Basti* is very important. At one point, Zakir remarks that "sitting in the Shiraz chewing over literature and art and politics isn't everything" (*Shiraz mēṅ baiṭh kar adab aur art aur siyāsat big̲h̲ārna hī to sab kuc̲h̲ nahīṅ hai*) (115). The irony is notable, because in fact 'chewing over politics' is all that is ever done throughout the novel, particularly in the case of Zakir and his friends (Afzaal, Irfan, Ajmal et al.). Here again, what is important to note is that meeting in a public space such as a 'tea-house' is a possibility unique to the city. It is a place where strangers no longer remain strangers. For example, it is in the tea house that Zakir and his friends encounter the nameless white haired man, and induct in their group the young intellectual Zavar. These are people with similar fears and hopes for Pakistan who become intimately known to each other during the time of political crisis. Such an opportunity is only afforded by the city, and in particular the city of Lahore in *Bastī.* Shiraz eventually becomes the 'camp' (*ḍera*) for Zakir (104). He feels a gravitational pull towards it and considers it to be a place which is more familiar and comfortable than his own home. He finds himself lured into it whenever he is anxious, bored or happy. "Now it was no longer possible for him to take advantage of the leisure and solitude to sit at his ease … Now what's to be done? All right, I'll go to the

Shiraz. *"Ab is kē līyē mumkin nahīṅ rahā ṯẖā kē vo is fursat aur tanhā'i sē fa'idā uṯẖā kar ārām sē baiṯẖē…Pẖir kyā kīyā jā'ē? Acẖcẖā Shiraz maiṅ chaltē haiṅ"* (60).

As a flâneur, it is not surprising that Zakir finds himself to be at ease in a public space such as the Imperial or the Shiraz. The Shiraz hosts people who are like Zakir; itinerant and restless- the 'public' men (there are, of course, hardly any women at the Shiraz). There is barely any description in the novel of the domestic life that Zakir leads; in fact it can be said that the city is Zakir's real home. Not only is it home to Zakir, but to all people in the city who consider themselves to be homeless and uprooted. For example, a friend of Zakir's "had lived comfortably and securely here in his own ancestral home since long before Partition. But in this new atmosphere of houselessness and homelessness, his heart was alienated from his ancestral home and he chose to be homeless, he came and camped in the Shiraz" (*Ko'i taqsīm sē pehlē sē yahāṅ apnē jaddī makān mēṅ acẖcẖā bẖalā rehtā ṯẖā magar bē gẖarī, bē dardī kī is na'ī fizā mēṅ jaddī gẖar sē jī us kā uchāṭ hū'ā aur vo apnī marzī sē nigẖarāban is ṭẖaē pē ā baiṯẖā)* (104). It is as if the Shiraz provides a home to those who need one. In the city, no one is truly homeless.

Consumed by the City: Zakir and Lahore as One

At the outbreak of war (1971), the city fragments and descends into chaos. Zakir undergoes a similar ordeal. Nearing the end of the novel, he feels as if he is "not all in one piece" (*Usē lagā kē vo ikaṯẖā nahīṅ hai),* as if his body is being torn apart much like the city itself (244). He effectively internalizes the city- its buildings, the iron, the cement- and experiences the same violence that the city is experiencing, on his body. In the midst of an extreme existential anguish, he asks himself:

> Am I myself, or the rubble of myself? 'What a building sorrow has destroyed!'Am I in pieces? Everything around me is in pieces. Time too. In the womb of that one time there were so many times. I'm wandering, broken up -- through what times? *(Yē maiṅ hūṅ yā mērā malbā? Kyā ʿimārat ghamōṅ nē ḍẖā'i hai ? Maiṅ bikẖar gayā hūṅ ? Mērē ird gird sab kuch bikẖar chukā hai. Vaqt kē bātin maiṅ itnē vaqt ṯẖē. Maiṅ ṭūṭ pẖuṭ kar kin kin vaqtōṅ maiṅ bẖaṭaktā phir rahā hūṅ?)* (244)

It is clear here that Zakir has an intimate relationship with the metropolis. When the city is under attack, so is he. At another point he notes that "the things all around absorbed me more and more. This city…was becoming a part of me, and moreover its shape was changing before my eyes" (*Yēe shehr…mērē andar samā rahā tḫā aur is shehr kā naqshā to dēkhtē dēkhtē bohut badal gayā tḫā)* (103). Clearly the city has been internalized; it has become an intrinsic part of Zakir. Instead of Zakir having accepted the city as his *bastī,* the city takes up residence in Zakir's soul.

It is interesting to note that the characteristics of the city can also be used to aptly describe Zakir. While Rūpnagar was an idyllic community, characterized by harmony and innocence, the city is quite the opposite. It is cold, desolate, uncaring and mechanical. At times indifferent to the ordinary man, the city stops for no-one and continues to exist notwithstanding wars and rioting. Much in the same manner, Zakir is a deeply individualistic person who is aloof to everything, alienated from his family and friends and estranged from even himself. He is apolitical, and asocial; much like the city. If the city (the buildings, roads and cars) were to be taken as a body, its residents can be considered as its soul. Zakir is like a building without inhabitants, a city without a soul. He is hopeless, indifferent and unable to sleep. He is unable to *feel; "*since morning he'd had the most intense need to think, to feel. The more he tried, the more he was overpowered by numbness" *(vo..mehsūs karnē kī koshish kartā rahā. Jitnā us nē mehsūs karnē kī koshish kī, utnī hī us pē bēhisī tārī hotī ga'ī")* (290). What then, differentiates him from the inanimate buildings, the wide unmoving road and the empty market places?

The city for Zakir is where he spends his youth, comes of age and finally matures, both physically and ideologically. It is in the city that Zakir meets Aneesa and then Tasneem, it is in the city that he befriends Afzaal the poet and spends his time talking about flowers, *'ishq'* and the impending war. Alongside being his home, the city is also the place of violence, destruction, anxiety and irresolution. For Zakir, the city is a special platform which allows him the freedom to move freely and aimlessly- it is also the place where he can become a stranger in the crowd and immerse himself in that experience. It is not surprising then, to consider the extent to which he internalizes the city:

> Then where does this smoke come from? From where? From inside me? But where am I myself? Here, or there? There in the ruined city? And the ruined city? <u>But I myself am</u> <u>the ruined city</u>. (*phir yē dhūvaṅ kahāṅ*

sē uṭẖā hai? Kahāṅ sē? Mērē andar sē? Magar maiṅ to khud kahāṅ hūṅ ? Yahāṅ yā vahāṅ? Vahān girē hu'ē shehr maiṅ? Aur girā hu'ā shehr? Magar girā hu'ā shehr to maiṅ khud hūṅ)

And indeed, Zakir is nothing short of a 'ruined city"; once serene and beautiful, now abandoned and scarred.

(Noor Habib is a student of LUMS)

Works Cited

Benjamin, Walter, Howard Eiland, Kevin MacLaughlin, and Rolf Tiedemann. *The Arcades Project*.
Cambridge, MA [etc.: Belknap, 1999. Print. Husain, Intizar. *Basti*. Lahore: Sang E Mil, 1983. Print.
Intizar, Husain, and Frances W. Pritchett. *Basti*. New York: New York Review, 2013. Print.

NUMUD

Annual Students' Magazine

Volume 3, 2014

Gurmani Centre for Languages and Literature

Lahore University of Management Sciences

Opposite Sector 'U', DHA Lahore Cantt 54792, Pakistan

UAN: +92-42-111-115-867 Email: numud@lums.edu.pk